Sceat Mohd Ali

شہید ملت

مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ

مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ کا آخری فوٹو

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے (جوہرؔ)

سیرتِ محمد علیؒ

یعنی

شہیدِ ملت مولانا محمد علیؒ

کی

مکمل سوانح حیات

مرتبہ

مولانا خورشید علی صاحب مہر

پبلشر

حامد حسین قریشی مالک رسالہ نئی روشنی و قریشی بکڈپو

کوچہ چیلاں دہلی

مطبوعہ آرمی پریس ۱۹۳۱ء دریا گنج دہلی

طبع اول دو ہزار

قیمت عہ ر

فہرست مضامین

مقدمہ

سمندروں کے جزر و مد میں جس طرح پانی کا اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے حوادث میں قوموں کا توازن ہوتا ہے۔ اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے صرف فلاح و بہبود کا زمانہ دیکھا ہو۔ اور وہ حوادث کا شکار نہ ہوئی ہو۔

ماہرین آثار عتیقہ کہتے ہیں۔ ہندوستان کا تمدن اور اس کی شائستگی کی قدیمی داستانیں ہندوستان کے کھنڈروں میں اب تک محفوظ ہیں۔ نینوا اور بابل کے محل ان کی عظمت و وقار کو اپنے آغوش میں لئے بیٹھے ہیں۔ مصر کے اہرام وہاں کے معارف و علوم کے خزینہ دار ہیں۔ ایتھنہ کے آثار قسطنطین اور جولیس سیزر کی شوکت و حشمت کے کلید بردار ہیں۔ ریگستان عرب کے ذرے اسلامی وحدانیت و تمدن و مذہب کو ابھی تک آشکارا کر رہے ہیں۔ غرض دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے اقبال کا ستارہ نہ چمکا ہو۔ اور اس کے ارتقاء کے نقش نہ صرف اوراق و آثار پر بلکہ اقوام عالم کے دلوں پر مرتسم نہ ہوں یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کوئی اقبالمند قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو جو قوم اس کی جگہ لیتی ہے۔ وہ اس کی تہذیب و شائستگی کے آثار پر اپنی عمارت بناتی ہے۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ زوال پذیر قوم کے نقش و نگار اس میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ اور کبھی وہ تو بدستور قائم رہتے ہیں مگر اس قوم کی درماندگی اور تھکاوٹ اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ ان کو ابھارنے کی کوشش کرے۔ بالخصوص جبکہ مایوسی نے اس کے دلوں پر قبضہ کر لیا ہو۔ اور یاس نے اس کی تکین کو اور بھی بڑھا دیا ہو۔ یہی وہ قومیں ہیں۔ جو زندہ ہیں مگر مری ہوئی۔ اور موجود ہیں مگر گمنام۔

لیکن جو قومیں اس تھکن سے صرف اس قدر کام لیتی ہیں کہ ذرا آرام کرنے کے بعد پھر سرگرم عمل ہوں۔ وہ نہ گمنام ہوتی ہیں اور نہ مردہ بلکہ وہ اپنی تھکاوٹ کے زمانہ تک

آرام لینے کے بعد پھر اسی عزم و استقلال سے اٹھتی ہیں۔ اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور گئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرتی ہیں۔ اس کے بطل حریت مصطفیٰ کامل پاشا اڈیٹر اللوا کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ

"اقوام کی تہذیب مدنیت اور برتری کی تربیت اور رہنمائی کرنے کے لئے وہ اسباب بہترین ہوتے ہیں جن کی بدولت مردہ اقوام انتہائے ترقی پر پہنچ جائیں۔ اور مایوس دلوں پر عظمت و وقار کا تاج رکھدیں۔ اور ایسی اقوام کے لئے عمدہ نظیر ثابت ہوں جن کے دل بیداری سے تھک کر بیٹھ نہیں رہے گئے ہیں۔ اور شہری مصیبتوں اور وطنی شکستوں نے ان میں یاس و ناامیدی پیدا نہیں کردی ہے۔ بلکہ ان کو یقین ہے کہ آزادی اور فلاح کا ہر شخص حصہ دار ہے۔"

ہمارے برادران ملت کا یہ کہنا۔ اور اپنے عمل سے یہ بتانا کہ ہم وہ قوم ہیں جن کی تہذیب اور شائستگی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اور ہماری مدنیت کو سیاسی وجود کے زبردست ہاتھوں نے فنا کے گھاٹ اوتار دیا۔ اس میں یورپ کے مدنیت سے ٹکرانے اور مقابلہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا ہم کو اپنے مستقبل کے لئے جدوجہد کرنے کا خیال ترک کرکے مغربی حکمبرداری اور سیادت کے آگے سر تسلیم خم کردینا چاہئے بالکل غلط ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے امریکہ، جاپان اور روس کی ایسی مثالیں موجود ہیں جو ہمارے اس خیال کو قطعاً باطل کرتی ہیں۔ صرف دیر اس کی ہے کہ ہم کمر ہمت باندھ کر چست ہوجائیں۔ اور منزل مقصود کی طرف چل کھڑے ہوں۔

یہی وہ نکتہ ہے جس کو ہر قوم کا فقید المثال قائد پیش نظر رکھکر آگے بڑھتا ہے اور اپنی قوم کو فلاح و بہبود کی طرف دعوت دیتا ہے۔

ہر تھکی ہوئی قوم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کوئی قائد ہو۔ لیکن یہ قدرت فیصلہ کرتی ہے کہ قائد کون ہے۔ قدرت کے اس فیصلہ کا علم قوم کو اس وقت ہوتا ہے۔ جب اس

ہیں سے کوئی شخص آگے بڑھ کر قوم کو اپنے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اب اگر قوم اس شخص کے پیچھے چل کھڑی ہوتی ہے تو یقیناً منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے، ورنہ نہیں۔

یہی حال ہماری ہندوستانی مسلم قوم کا ہے کہ قدرت نے اس کو ایک عدیم المثال قائد دیا۔ اور وہ قائد چلا چلا کر مسلمانوں کو اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ہر قدم پر اس نے قوم کو آگے بڑھنے کی ہمت دلائی۔ مگر قوم ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس قائد نے اپنی پوری کوششیں اس کے بیدار کرنے میں صرف کر دیں۔

اپنی دولت اپنی عزت اپنی صحت یہاں تک کہ اپنی زندگی قوم پر قربان کر دی۔ مگر آہ! اے بدبخت قوم تجھے اس کی آواز پر لبیک نہ کہنا تھا۔ نہ کہا۔ تجھے اس کے نقش قدم پر نہ چلنا تھا۔ نہ چلی۔ اور بالآخر تو نے اپنے نادر الوجود جوہر، اپنے بے مثال لیڈر کو صرف اپنے جمود، اپنی غفلت، اپنی لاپروائی سے اپنے سے دور کیا۔ اور ایسا ناراض کیا کہ اس نے مرنے کے بعد تیری سوسائٹی میں رہنا عار سمجھا۔ اور جس زمین پر تو بستی ہے اس میں دفن ہونا گوارا نہ کیا۔ آہ تم سمجھتے ہو کہ یہ کون ہے؟ یہ کس کا ذکر مبہم ہے؎

سن سن کے سب کی باتیں آتا ہے مجکو رونا
اندوہ خیز ذکر مبہم آج ہے کس کا

آہ یہ وہ مولانا محمد علی مرحوم ہے۔ یہ وہ شخصیت ہے جو صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے عالم وجود میں آیا۔ مسلمانوں کی فلاح کے لئے زندہ رہا۔ اور مسلمانوں کی فلاح کے لئے مرا۔ اور جو آج بیت المقدس کی سرزمین پر چادر خاک تانے صرف اس لئے سو رہا ہے کہ عمر بھر قومی فلاح کے لئے جد و جہد کرتے کرتے تھک گیا تھا۔

مسلمانو! ہاں صرف مسلمانو! سنو۔ سنو اور بار بار سنو کہ تم نے اس کی قدر نہیں۔ تم اس کی ہستی کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ تم نے اس کی مساعی کو مشکور نہ ہونے دیا۔ اس لئے وہ آج تم سے خفا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہا۔ تم میں رہا۔ اب مرنے کے بعد وہ تم سے جدا ہے

مگر افسوس کہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ کہ مرنے کے بعد ارض مقدس کو کیوں پسند کیا۔ اس لئے کہ تم نے
اپنی نااہلی سے ثابت کر دیا کہ تم اس قابل نہیں کہ کوئی خیر خواہ تم میں رہے۔ اور اگر یہ بات نہیں
ہے تو آؤ اور اس مقصد عظیم کو لیکر اٹھو جس کی تمام عمر اس نے تم کو دعوت دی اور اپنی طاقت عمل سے
ثابت کر دو۔ کہ بیشک زندگی میں مایوسی۔ اور مایوسی کی زندگی دونوں بے معنی لفظ ہیں۔

یہی نہیں بلکہ تم کو اپنی ساعی سے اس وقت تک دست بردار نہ ہونا چاہئیے جب
تک اپنے وطن مقدس کو آزاد کرا کر مولانا محمد علی رح کی ہڈیوں کو اپنے وطن میں نہ لے آؤ جس طرح
فرنچ قوم نپولین بونا پارٹ کی ہڈیاں لیکر آئی تھی۔

اگرچہ ہم میں آج محمد علی نہیں۔ لیکن اس کی زندگی ہمارے لئے لائحہ عمل کا کام دیگی۔
اور ہر قدم پر چراغ ہدایت ثابت ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اس بلبل حریت اس قائد اعظم
کے حالات مرتب کرنے کی ہمت کرتے ہیں۔ وہ قائد اعظم جس نے مصطفے کامل پاشا کی طرح
(جس نے مصر کو آزادی کی راہ پر ڈالا) ہندوستان کو حریت کا سبق پڑھایا۔ آزادی کا
درس دیا۔ لیکن شاباش سرزمین مصر کہ اسنے مصطفے کامل پاشا کی جانشینی کیلئے سعید حلیمی پاشا
سعد زاغلول پاشا نحاس پاشا جیسی شخصیتیں پیدا کیں۔ اور افسوس سرزمین ہند پر کہ
مولانا محمد علی کی جانشینی کے لئے نگاہیں تلاش کرتی ہیں۔ مگر کوئی نظر نہیں آتا۔ تاہم ہم مولانا
کے نقش قدم پہ چلنے والوں کے لئے مولانا کے سوانح حیات مرتب کرتے ہیں۔ اب یہ قومی
افراد کا کام ہے کہ وہ ان سے سبق اموز ہو کر سرگرم عمل ہوں۔ یا نہ ہوں۔ بہر حال اپنی
بساط کے موافق جہاں تک ممکن ہے صحیح حالات مرتب کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ اور
سیرت کو مکمل کرنے کے لئے اہل ملک کے آزادی حاصل کر کے آخر میں درج کر دیجائیگی۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

خورشید علی مہر
۲۱۔ فروری ۱۹۳۱ء

کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
ز جام دہر مئے کل من علیہا فان

مرنے والے کی یادگار کی تجویز ملک و قوم کی طرف سے اگر اس کی خالص ہمدردی. ایثار و قربانی کا صلہ ہو تو یقیناً ملک و قوم کی احسانمندی اور قدر دانی کا ایک بیّن ثبوت ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ صحیح معنوں میں کس قسم کی یادگار حقیقی یادگار ہو سکتی ہے۔ آجکل رسائل و اخبار میں مختلف تجاویز" یادگار رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کیلئے پیش کی جا رہی ہیں یہ بھی صحیح ہے کہ وہ تجویزیں معمولی دل و دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہیں۔ اس واسطے یہ تو آسانی سے نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی تجویز قابلِ پذیرائی نہیں البتہ غور کرنے کا سب کو حق حاصل ہے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ کون سی تجویز ما بہ الامتیاز ثابت ہو۔

رئیس الاحرار کی حیات کا ہر لمحہ قیمتی تھا۔ اور اس قابل کہ اس کی پیروی سے وہ خصوصیات و امتیازات جو اُن کی ذاتِ گرامی میں مجتمع ہو گئے تھے اگر ؛ سبھی نہیں تو کسی طور پر ضرور حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارے خیال میں اگر کوئی یادگار ہو سکتی ہے تو اُن کی مفصل و مکمل سیرت ہے جسمیں اُن کی زندگی کے ہر دور اور شعبہ پر غائر نظر ڈالی گئی ہو۔ کیونکہ انکے اعمال اور گرانقدر کارنامے سبق آموز ہی نہیں ولولہ انگیز بھی

سیرت کی تدوین و ترتیب کا مقصدِ اولین بھی یہی ہوتا ہے کہ ہر رہروِ ملکِ عدم کے

نقش قدم پر چل کے بزرگی اور اعمال صالحہ سے مستفیض ہو۔ نیز مرحوم کے قول و فعل کو منظر عام پر لا کے زندگی کے حیات افروز و سبق آموز کارنامے یاد دلائے جائیں۔ آئندہ افراد قوم متاثر ہو کے اس کی عظمت محسوس و فوائد عامہ و ہمدردی قوم و ملت کے جادہ پر گامزن ہوں اگرچہ ایصال ثواب مذہبی پہلو سے مرحوم کی خدمات کا صحیح بدل ہے اور تقدیم اس کی اولیٰ تاہم تدوین سیرت مادی و عملی حیثیت سے خیرائے خدمت کے واسطے جزو لاینفک ہے۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سیر بزرگان دین و ائمہ علوم و فنون کی تالیف کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ان کے اقوال و افعال سے اکتساب کیا جائے۔

سیرت نگاری فی نفسہ خود ایک فن ہے جس پر قلم اٹھانے کی جرأت آسان نہیں اس وادی میں قدم قدم پر رکاوٹیں اور دشواریاں لاحق ہوتی ہیں۔ پھر مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح حیات کی تدوین تو اور بھی دشوار ہے۔ بڑی کاوش اور تلاش کی ضرورت پڑی مولانا کی سیرت کے انضباط کیلئے گویا ہندوستان کے نصف صدی کے دور ارتقاء پر مورخانہ نظر ڈالنے اور تقریباً چوتھائی صدی کے واقعات عالم اسلام پر عبور و تفصیل کی ضرورت پڑیگی۔

سیرت نگاری کے شوق یا مولانا محمد علی کی یادگار کو نقش اول بنانے کی مصروفیتوں نے اگرچہ ہمیں السابقون الاولون کی فہرست میں جگہ دینے کا موقعہ نہیں دیا۔ لیکن جن لوگوں نے یہ فخر حاصل کیا ہے اس نے ہمیں یہ جرأت ضرور دلا دی کہ کم سے کم ہم بھی اپنی بساط کے موافق ع

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

کا طرۂ امتیاز حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ مولانا کی سیرت نگاری کا اہم فرض ہم کہاں تک انجام دے سکیں گے لیکن السعی منی والاتمام من اللہ پر نظر کرتے ہوئے اس فرض کی ادائیگی کے لئے میدان عمل میں آنے کی جرأت کرتے ہیں۔ جو ملک کی ممتاز جماعت کا کام تھا۔ اور جسے مقتدر ہستیوں کی متفقہ کوشش پورا کر سکتی تھی۔

چونکہ یہ حالات اب بھی عجلت میں قلم بند کئے جا رہے ہیں۔ لہذا سیرت کی تکمیل کے لئے موجودہ رہنمایانِ ملک وقوم سے اپیل ہے۔ کہ وہ مرحوم کے واقعات پر اپنے مذاق کے مطابق روشنی ڈالتے ہوئے اپنے تجربات اور مشاہدات سے بھی مطلع فرمائیں۔ تاکہ سیرت کے دوسرے حصہ کی تدوین میں آسانی ہو۔ اور اس کی تکمیل میں کسی اہم جزو کی کمی نہ رہ جائے۔

اگرچہ رئیس الاحرار کی یہ سیرت اپنی جگہ پر مکمل ہو گی۔ لیکن یہ ہمارے امکان سے بعید ہے کہ مختصر کو مبسوط ثابت کریں۔ ہاں جامع ضرور ہو گی۔ اور آئندہ حصص کی ترتیب میں کلیات وجزئیات کی تفصیل دے کے یہ کمی بھی پوری کی جا سکے گی ؎

نہ من بر آن گل عارض غزل سرایم وبس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند
حافظ رح

حسرت لکھنوی
۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء

۷۸۶

سیرت محمد علی

محمد علی کی خاندانی حیثیت

مولانا محمد علی رح کا آبائی وطن ایک روایت کے اعتبار سے نجیب آباد ضلع بجنور ہے اور وہاں سے ان کے دادا علی بخش خاں ترک سکونت کر کے مراد آباد میں سکونت گزیں ہوئے اور ایک قول کے مطابق اصلی وطن مراد آباد ہی تھا۔ اور تمام بزرگ خاندان نے وہیں تدریجی ترقی کی۔ بہر حال یہ فیصلہ شدہ ہے کہ آپ کے دادا علی بخش خاں مراد آباد میں سکونت پذیر تھے فرمانروائے رامپور نواب یوسف علی خاں کے عہد میں رامپور پہنچے۔ اور اپنی قابلیت سے ریاست کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے۔ ملازمت کے بعد رامپور میں سکونت منتقل کر لی۔ اور اپنی حسن خدمت اور قابلیت سے نواب کی نظروں میں عزت پیدا کر کے نواب کے معتمد علیہ بن گئے۔ یہی وجہ تھی کہ غدر ۱۸۵۷ء میں انہوں نے انگریزوں کی خاص امداد و اعانت کی اور اس خیر خواہی کے صلہ میں ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جب تقسیم انعامات کا وقت آیا۔ اور حکومت برسر اقتدار ہوئی۔ تو خان کا خطاب اور ضلع مراد میں موضع خانی سمار جاگیر میں ملا۔ آپ صرف آبائی شیخ ہیں۔ بلکہ حضرت امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کا شجرۂ نسب شروع ہوتا بتایا جاتا ہے علی بخش خاں نے ریاست رامپور کی جانب سے غدر میں انگریزوں کی اعانت کی تھی جس کی تفصیل درج ذیل ہے:-

"جولائی ۱۸۵۸ء میں نواب یوسف علی خاں نے بہت سا سامان کمبل کوٹ وغیرہ اور کچھ اشیاء خوردنی شیخ علی بخش خاں کو دیں کہ نینی تال پر

صاحب کمشنر کو پہنچا دیں۔ علی بخش خاں سامان رسد لیکر پچیس سواروں کے ساتھ کالاڈھونگی کو روانہ ہوئے۔ رات کے وقت کالاڈھونگی پہنچے، دیکھا تو دشمنوں نے وہاں محفوظ مورچہ قائم کر رکھا تھا۔ اس لئے نہ پہنچ سکے۔ اور خفیہ طور پر واپس ہو کر رامپور آئے اور وہاں سے دوبارہ سامان کر کے براہ ہلدوانی نینی تال پہنچے۔ اور صاحب کمشنر کو سامان رسد پہنچایا۔ تمام انگریز جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ یہ دیکھکر بہت خوش ہوئے اور کپڑے کے گٹھروں کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر لے گئے۔ کیونکہ وہاں سردی کی وجہ سے بہت تکلیف تھی۔ اس کے بعد کئی بار علی بخش خاں نے اسی طرح سامان رسد پہنچایا۔ اور نہایت دیانتداری سے متعلقہ خدمات کو انجام دیا چنانچہ اس صلہ میں حسب ذیل پروانہ وجاگیر عطا ہوئی:-

"شیخ علی بخش خاں نے خاص کئی تدابیر سے نواب صاحب اور افسران سرکار انگریزی مقیم نینی تال کے درمیان پیام رسانی جاری رکھی۔ گورنر جنرل بہادر نے ان کو اپنے سامنے پانچہزار کا خلعت بخشا اور ارشاد ہوا کہ ان کو مواضع ضبطی (سماچار خانی) جن کی آمدنی تین ہزار روپیہ سالانہ داخل سرکار ہوتے ہیں بخش کر ان کی خدمت آیندہ اقبال کی جائے۔"

محمد علیؒ کے والدین

شیخ علی بخش خاں کے صاحبزادہ شیخ عبدالعلی خاں صاحب بھی ریاست رامپور میں ایک معقول عہدہ پر ممتاز تھے۔ اور خود ایک صاحب جائداد رئیس۔ آپ کی شادی نواب درویش علی خاں پنجہزاری (دربار اکبری) کی صاحبزادی آبادی بانو بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی۔ آبادی بانو ایک روشن خیال نیک طینت دیندار خاتون تھیں جو بعد کو بی اماں کے لقب سے مشہور ہوئیں اور آج تک ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا اسی لقب سے یاد کرتا ہے۔

عبدالعلی خانصاحب کی اولاد

آپ کے پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں جن میں سب سے بڑے تین برس کی عمر سے مرگی کے مرض میں مبتلا رہے اور عرصہ ہوا وفات پا چکے ہیں۔ ان سے چھوٹے ذوالفقار علی خاں صاحب علم دوست بزرگ ہیں۔ جو قادیانی ہوکر عرصہ دراز تک جماعت قادیان کے منصرم اعلیٰ رہے اور اب بھی ریاست رامپور میں سپرنٹنڈنٹ محکمہ آبکاری کے عہدہ پر مامور ہیں۔ اس سے قبل بھی آپ اسی عہدہ پر فائز تھے۔ تیسرے منشی نوازش علی خاں مرحوم جو رامپور میں عدالت دیوانی میں بعہدہ محافظ دفتر مامور تھے۔ اور عرصہ ہوا وفات پا چکے ہیں۔ چوتھے مولانا شوکت علی صاحب ہیں جن سے ہندوستان کا ہر شخص واقف ہے۔ پانچویں سب سے چھوٹے مگر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے خاص شہرت کے مالک مولانا محمد علی مرحوم تھے ؎

زباں پہ بار آلٰہا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

یہی ہماری سیرت کا ہیرو اور وہ قابل قدر جوہر ہے جس نے خوابیدہ ہندوستان کو بیدار کرنے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔

محمد علی کی ولادت

۱۸۷۸ء کے مبارک سال میں مولانا محمد علی کائنات کی بیکراں نعمتیں اور بے پایاں برکتیں اپنے اندر لئے ہوئے پیدا ہوئے۔ کون جانتا تھا کہ غلام ملک کا ایک انسان مستقبل میں لوگوں کو آزادی کا نغمہ سنائے گا اور اپنی شعلہ بار اور دھواں دھار تقریروں سے ہندوستانیوں کے سینوں میں آزادی کی آگ لگا دیگا کسی کو خبر نہ تھی کہ قدرت نے اسے "آزادی کا پیغمبر" اور حریت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ وہ غلاموں کو آزادی کا مژدہ سنائے اور اپنی جرأت وہمت

شجاعت وبطالت کی اطراف واکناف عالم میں دھوم مچادوے۔

طفولیت وتربیت

مولانا محمد علی نے ابھی اپنی عمر کے دو سال بھی پورے نہ کئے تھے کہ آپ کے شفیق باپ نے ہیضہ کی بیماری سے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے یتیم بچوں کو ۲۷ سالہ بیوہ کے آغوش تربیت میں چھوڑ گئے۔

ایک بیوہ کے لئے اس سے زیادہ حوصلہ شکن اور کیا بات ہوسکتی تھی کہ جوانی کے عالم میں اس کا شوہر دائمی مفارقت اختیار کرے۔ نہ کہ بچوں کی تربیت وتعلیم کا بار بھی اس کے سر چھوڑ جائے۔ مگر بی اماں معمولی عورت نہ تھیں جو شوہر کی مفارقت میں بچوں کی تربیت کو بھول جاتیں اور انہیں بجائے گوہر گراں مایہ بنانے کے خزف ریزوں میں پھینک دیتیں۔ ادھر قدرت کی فیاضی نے بی اماں کو وہ دل دیا تھا جس میں قومی درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا وہ ایک ان تھک عورت تھیں جو رکاوٹوں سے نہ رکنے والی شیرنی کی طرح اپنے بچوں کے دل ودماغ کو غلامانہ ذہنیتوں۔ اور پست خیالوں سے بچاتی ہوئی آزادی اور عالی حوصلگی کے مراحل طے کرنے کے اسباب فراہم کرتی رہیں۔ اگر سچ پوچھو تو یہ اسی عالی حوصلہ خاتون کی ابتدائی تربیت کا نتیجہ تھا جس نے محمد علی کو محمد علی بنا دیا۔ ورنہ کہنے کو اس نام کا اب بھی ہندوستان میں سینکڑوں اور ہزاروں آدمی ہیں۔ مگر ان میں اس دل ودماغ کا ایک بھی نہیں

ابتدائی تعلیم اور علیگڈھ کالج

ہوشمند ماں نے ابتدائی تعلیم ختم کرانے کے بعد علیگڈھ کالج میں داخل کر دیا۔ جو اس وقت تنگ نظر اور قدامت پسند مسلمانوں کے نزدیک کفر والحاد کا مرکز تھا۔ مسلمان اس سے گریزاں تھے۔ اور اس کی تخریب میں ہمہ تن ساعی۔ محمد علی نے اسی درسگاہ میں اپنی ذہانت اور خداداد استعداد سے بہت کچھ ترقی کی۔ اور اسی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے بیحد ہر دلعزیز ہوئے کالج میں ان کی عدیم النظیر ذکاوت اور نادر المثال ذہانت کی دھوم تھی۔ خوش خلقی اور ملنساری کی بدولت کالج کا ہر شخص ان کا مداح تھا۔ اسی زمانہ میں تحریر و تقریر میں بھی امتیازی

امتیازی شان پیدا کرلی تھی۔ ہم جماعتوں میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ طلبائے کالج ان کی قابلیت اور تحریر و تقریر کی مہارت کے معترف تھے۔ ایک عرصہ تک وہیں تعلیم پائی۔ اور بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد علیگڈھ کو خیرباد کہا۔ اور واپس رامپور تشریف لائے۔

محمد علی آکسفورڈ میں

کالج سے فارغ التحصیل ہوکر جب رامپور پہنچے تو نواب محمد اسحق خاں صاحب کی سفارش سے "انڈیا سول سروس" کے امتحان کے لئے ریاست کی طرف سے وظیفہ مل گیا۔ اور آپ لندن تشریف لے گئے۔

۱۸۹۸ء سے لیکر ۱۹۰۲ء تک آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پاتے رہے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ اور اپنی ذہانت کی بدولت بی اے کی ڈگری نہایت امتیاز سے حاصل کی۔ لیکن آئی سی۔ ایس کے امتحان میں ناکامی ہوئی۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ۔ آئی سی۔ ایس کے نصاب سے ان کو دلچسپی نہ تھی۔ اپنا سارا وقت مطالعہ کتب اور اخبار بینی میں صرف کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت ان سے کچھ اور کام لینا چاہتی تھی یہی چیز ہے جس نے ان کی آئندہ زندگی میں زبردست انقلاب پیدا کردیا۔

کیا یہ غلط ہے کہ وہ اگر ناکام نہ ہوتے تو قوم اور ملک ان کی خدمات جلیلہ سے محروم رہ جاتی۔ پھر بتایئے یہ کامیابی تھی یا ناکامی؟

انگلستان سے مراجعت وملازمت

آکسفورڈ میں مولانا محمد علی کی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت نے جو شہرت حاصل کی تھی۔ اس نے ان کے ہم سبق، ریاست بڑودہ کے راجکمار کنور فتح سنگھ کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اور ان کو مولانا محمد علی سے ایک خاص انس ہو رابطہ ضبط پیدا ہوگیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کنور فتح سنگھ کی کوشش اور تحریک سے مولانا محمد علی کو ریاست بڑودہ میں محکمہ افیون کے افسرائی کا عہدہ دیا گیا۔ جہاں آپ نے اپنے فرائض نہایت دیانت،

مستعدی اور راست بازی سے انجام دیتے ہوئے۔ آمدنی میں معتدبہ اضافہ کردیا۔ مہاراجہ بڑودہ آپ کی کارپردازی سے بہت خوش ہوئے۔ اور قدردانی کرتے ہوئے آپ کو نوساری کا کمشنر بنادیا۔

آپ نے کمشنری کے زمانہ میں بھی جبلی عادت سے کام لیا۔ غریبوں کا ہر طرح لحاظ کیا۔ اور ان پر خاص عنایتیں کرتے ہوئے طرح طرح کے مصائب اور مظالم کا جن کا وہ مدت سے شکار تھے سدباب کردیا۔

کمشنری کے بعد ولیعہد موصوف کے پرسنل اسسٹنٹ ہوگئے۔ آپ کے اخلاق جمیلہ اور اوصاف حمیدہ نے ریاست کے تمام باشندوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ آپ کی دیانت کا یہ حال تھا کہ اپنے زمانہ ملازمت میں رشوت تو ایک طرف ہدیہ اور نذرانہ بھی نہ لیتے تھے۔

یہ زمانہ آپ کے شباب کا تھا۔ دولت قدموں پر لوٹتی تھی۔ زندگی عیش و عشرت سے گزر رہی تھی۔ اگر چاہتے تو اپنی زندگی نہایت کروفر اور شان و شوکت سے گزارتے لیکن آپ دولت کے بھوکے نہ تھے۔ نہ عیش و عشرت اور جاہ و حشم کی ہوس تھی۔ آپ نے ان تمام دنیاوی وجاہتوں کو دیکھا اور پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواب صاحب جاورہ نے بھی وزارت پیش کی لیکن آپ نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔

طبیعت کا فطری رجحان

اسی زمانہ میں آپ کے اکثر مضامین ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کے ابتدائی مضامین "موجودہ بے چینی پر چند خیالات" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے جو بعد کو کتابی صورت میں بھی طبع ہوئے جس کو لنٹو مارلے نے بہت پسند کیا۔ (یہ مضمون اور مولانا کے دیگر مضامین دوسرے حصہ میں ہیں) منٹو مارلے اسکیم پر بھی آپکا سلسلہ مضامین شروع ہوا اور اس سلسلے میں مسٹر گوکھلے سے ایک طویل تحریری مباحثہ چھڑ گیا جس میں آپ نے اپنی قابلیت کے خوب خوب جوہر دکھائے۔

رئیس الاحرار کی زندگی پر انقلاب

(از حسرت لکھنوی)

اس عالم کون و فساد میں جب کوئی عظیم الشان شخصیت دارالبقا میں اپنا داغ مفارقت دیجاتی ہے تو ذرہ ذرہ کو وہ احساس جو اس کے ذریعہ متمتع ہونے سے پیدا ہوتا ہے مضطرب بنادیتا ہے کائنات میں ایک ہلچل سی پڑجاتی ہے خودغرض انسان سے لیکر بے زبان حیوان تک اپنے چشم ابرو سے اظہار احسانمندی پر مجبور نظر آتے ہیں ہوا دہوس کے بندے ایک غیر معین وقت تک اپنے نامحدود مگر عارضی جذبات کا مختلف صورتوں میں مظاہرہ کرتے ہیں۔

اگر مقاصد میں خلوص عزائم میں استقلال ہو تو یہ بہا بہا تحریک عالم امکان کا بیش بہا کارنامہ ہوسکتا ہے اور اس سے کے غیر فانی فوائد آیندہ نسلوں کے واسطے سرمایہ دار۔ جذبہ کی بقا اور ترغیب تحریص کیلئے البتہ کوئی مستقل و موثر ذریعہ ہونا چاہئے کہ حسب ضرورت اس سے کام لیا جاسکے اگر مقصد میں سکون و جمود نظر آئے تو یہی مائیہ حیات آلۂ عمل بنایا جائے۔ مردہ احساس میں روح پھونک کر گذشتہ زمانہ کی بیداری اور زندگی پیدا کی جاسکے۔ طبائع کا اختلاف واقعات کی گوناگونی اکثر اغراض نصب العین زندگی کے سمجھنے میں غلط فہمی پیدا کرنے کے اسباب ہوجاتے ہیں اور طولانی بحث و مباحثہ کے بعد بھی یہ اختلافات ایک مرکز پر پہنچنے میں سنگ راہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نکتہ رس اور دانشمند افراد آخر اس حقیقت سے آشنا اور اپنی تعداد کی کمی کے سبب سے رفتہ رفتہ منزل مقصود تک اپنے ہمسفروں کو پہنچانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ بشرطیکہ ان میں قبولیت رہنمائی کی صلاحیت باقی ہو۔

ترتیب سوانح و تدوین سیرت کی اصل غایت یہی ہوتی ہے کہ صاحب سیرت کے تمام کمال اوصاف منظر عام پر لائے جائیں اور ان سے آیندہ نسلیں مستفید ہوکے اس کا نمونہ بننے کی سعی میں سرگرم ہوجائیں۔ صاحب سیرت کی کمزوریاں بھی اس مقصد سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہوتیں کہ ذمائم و نقائص سے بچنے کیلئے درس تمثیل کا کام دیں۔

فدائے ملک وملت۔ بطل حریت۔ رہنمائے قوم۔ قائدِ اعظم حسان الہند۔ مولانا والحاج محمد علی جوہر کے واقعات حیات کا انضباط اس قدر غیر معمولی اور اہم کام ہے کہ باوجود احتیاط واہتمام اندیشہ ہے کہ کوئی فروگذاشت تکمیل سیرت کو تشنہ نہ رکھے۔

تعلیم وتربیت کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے ان میں بجز خاص مقالات کے جو مرحوم کے ہم جماعت احباب نے سپرد قلم کئے ہیں۔ کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ مگر رسمی طور پر ان کا جزو سیرت ہونا لازمی تھا۔ اس لئے لکھدیئے گئے۔

اب تدریجاً وہ تمام حالات ضبط تحریر میں آئیں گے جو حیات جوہر کے زرین کارنامے ہیں۔ اور جن کا اس ذات گرامی میں پایا جانا ہی ان کی شخصیت عظمیٰ کا اصلی جوہر ہے۔

رئیس الاحرار کی لائف دیکھنے والے ایک طرف شاعر نغز گو فلسفی پائیں گے تو دوسری طرف صحیفہ نگار کی حیثیت سے اہل الرائے۔ اور ادیب سحر طراز۔ اگر مولانا سیاست دانی میں خاص دماغ وشہرت کے مالک ہیں تو قوم وملت کا سچا درد ان کے قلب پر مرتسم ہے۔ سراپا ایثار ومجسمہ ہمدردی انہیں اگر کہا جائے۔ تو ہندوستان کے ہندو مسلم اتحاد کا سب سے بڑا حامی ماننے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں اہم غدر، بہترین منصف۔ وفادار ثابت ہوئے۔ اسی قدر ملکی وقومی خدمات کے انجام دینے میں ان کی شجاعت وبسالت ناقابل انکار حقیقت تھی، ان کی تحریر کی جامعیت۔ ادبیت اور انشاء کی خصوصیت سے اگر ممتاز ہوتی تھیں۔ تو ان کی ... اور گہر بار تقریروں کا سکہ دلوں پر نقش ہے۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

قائد اعظم مولانا محمد علی صاحب جوہر تجنیس تسمیہ کے لحاظ سے حضرت طلبی ... ہر دو ... میں جس طرح پیش پیش رہتے تھے اسی طرح محمد اور علی رضؓ ذو ... نام ...

کی تجلیں نے ان پر ہم۔ خیر و برکت کی بارش کی اور ان کے پائے عزم و استقلال کو انتہائے الم میں بھی متزلزل نہیں ہونے دیا۔

آپ خدائے واحد و قدوس پر ہمیشہ بھروسہ کرتے تھے۔ شاہی دربار مہتم بالشان جلسہ انہیں مرعوب کرنے سے قاصر رہا۔ اپنی آزادانہ رائے دینے میں ہمیشہ آزاد رہے وہ جس ادارہ میں شرکت کرتے تھے اسمیں چار چاند لگا دیتے تھے خود انکے بنائے ہوئے متعدد دائرے تھے جو بڑی کامیابی سے انکی ہدایتوں کے بموجب چلتے رہے۔ ان کی زندگی میں عظیم الشان انقلابات رونما ہوئے لیکن ان کی مذہبیت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ ان کے حالات بتاتے ہیں کہ قیام انگلستان کے زمانہ میں بھی ماہ صیام بھر روزے رکھتے تھے نماز پوری مستعدی اور پابندی سے ادا کرتے تھے عقائد کے بارہ میں خود انکی تحریریں اور تقریریں بتاتی ہیں کہ کس قدر راسخ اور پختہ کار تھے علمی قابلیت کے متعلق انگریزی بی فارسی وغیرہ پر وسیع مطالعہ نے پورا عبور حاصل کرا دیا تھا۔ چونکہ التزام علی قائم رہا اسواسطے روز بروز ترقی ہوتی گئی

حسان الہند حضرت جوہر

آپ شاعر بھی تھے۔ لیکن مادی اور اعتباری شاعری سے بلند پر جوش جذبات اور واردات قلبی کے جامع۔ آپ کی شاعری میں مضمون آفرینی اور بلند پردازی ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ابتدائی کلام میں سلاست نہیں ہے لیکن آخر میں اس سے بھی آپ بہرہ یاب ہوئے ہیں۔

حضرت جوہر شاعر ہونے کی حیثیت سے مستحق ہیں کہ ایک جداگانہ حیات شاعری مرتب کی جائے۔ لیکن آپ کے تمام و کمال اوصاف و محامد کا ذکر مقصود ہے۔ اس لئے بقدر گنجائش چند سطور پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اور مختصراً نمونہ کلام بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین خود بقدر ذوق منتفع ہوں۔
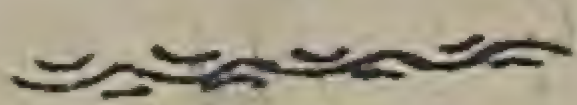
سوانح حیات کا دوسرا حصہ درس آزادی ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ (منیجر نئی روشنی دہلی)

جذبات جوہر

(فراغ حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینۂ طیبہ کی منزلیں طے کرتے ہوئے رئیس الاحرار مولانا محمد علی پر ایک خاص عالم شوق طاری تھا - آپ نے آخری منزل میں حسب ذیل نظم کہی جسے باواز بلند پڑھتے جاتے تھے۔ اور آپ کی آنکھیں عشق رسول میں ہوتی بکھیر رہی تھیں :-

سب سمجھتے ہیں کہ تو شاد ہے مسرور ہے آج — کون کہتا ہے دلا! تو دل رنجور ہے آج

کلفت قطع منازل ہوئی کافور ہے آج — ہے مدینہ سے جو نزدیک تو سب دور ہے آج

اپنے پلے کوئی سوغات نہیں اسکے سوا — نقد جاں نذر کرے دل یہی دستور ہے آج

سنگ در تک تو ہے کعبہ رسائی بخشی — دیکھوں کیا کیا مرے سرکار کو منظور ہے آج

آرزوہائے دو عالم تھیں اور اک دل کل تک — فقط اک تیری تمنا سے وہ معمور ہے آج

رقص بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجئے — حسن مسئول نہیں عشق بھی مجبور ہے آج

عشق خود بدعت و سرمایہ صد بدعت ہے — رحم کر رحم، کہ عاشق ترا معذور ہے آج

اب بھی دیدار سے محروم ہی رکھیگا ہمیں — تھی جو اک حسرت مایوس بدستور ہے آج

بچ گیا بھی جو انا الحق سے تو انت الحق ہے — میرے نعرے میں بھی مستی تھی منصور ہے آج

لن ترانی کی یہاں اب بھی وہی آتی ہے صدا — بیگماں قبۂ خضریٰ شجر طور ہے آج

چھوڑ رکھی تھی کبھی مسئلۂ موت و حیات — ایک جلوہ ہے عیاں تھا کبھی مستور ہے آج

جس سے چہرے دمک اٹھتے تھے کبھی تیرے سبب — دیکھو جوہر کی بھی آنکھوں میں وہی نور ہے آج
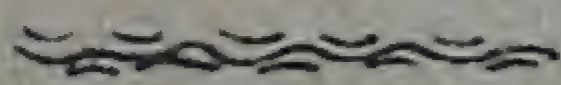
تجھے تسکین دل پایا تجھے آرام جاں پایا — نہاں بھی ہے تو کیا تجھکو جہاں ڈھونڈا وہاں پایا

ہمیں ہر چیز میں آئی نظر یارب ادا تیری — وہ کیسے ہونگے جن لوگوں نے تجھکو بے نشاں پایا

کوئی نامہرباں ہو کر ہمارا کیا بگاڑیگا
کرم تیرا تو ہے ہم پر تجھے تو مہرباں پایا

ترا وہ مبتلا ناکام سمجھا جس کو دنیا نے
اُسی کو سرخرو دیکھا اسی کو کامراں پایا

عنادل ہر چمن کی تیرے فصل گل سے بے پر وا
محبت کو تری ہم نے بہار بیخزاں پایا

حرم میں تھا ہر اک کو یوں تو تیرے عشق کا دعوے
جو کی تحقیق تو اکثر وہی عشق بتاں پایا

ہماری جاں بھی حاضر ہو اسکے اک اشارے پر
کہ جسکو اک جہاں نے آپ ہی جان جہاں پایا

کسی کو ڈھونڈتا دیکھو خود اپنے گوشۂ دل میں
تو بس سمجھو کہ اب اس نے سراغ لامکاں پایا

رہا آوارہ دیر و حرم پہلو سے بیگانہ
دل اسکا عرش و کرسی ہو کہاں ڈھونڈا کہاں پایا

خجل خود خجلت تر دامنی سے ہو گئی عاصی
تری رحمت کو جب دیکھا تو بحر بیکراں پایا

جہاں ایماں ہے واں کیسے گذر ہو یاس حرماں کی
کسی مومن کو بھی اے دل خدا سے بدگماں پایا

نہیں ہے سرکشوں کی سرکوبی میں وہ محتاج قوت کا
اسی کو چن لیا جسکو ضعیف و ناتواں پایا

وہ ساقی جس نے تلچھٹ تک نہ رکھی تکر فردا میں
اسے کوثر پہ ہم نے قبلہ گاہ میکشاں پایا

نہیں معلوم کیا ہو حشر جو ہر کا پر اتنا ہے
کہ ہاں نام محمد مرتے دم ورد زباں پایا

غزل

تصنیف کردہ بزمانہ طالبعلمی در علیگڈھ کالج ۱۸۹۷ء

کیوں مے پرست دیکھ کے مدہوش ہو گئے
شیشہ میں مے بھری تھی کہ اللہ کا نور تھا

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش
تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا

کیوں تاب دید حضرت موسیٰ نہ لا سکے
کیا پہلوئے عدو کی طرح کوہ طور تھا

خوش قسمتی سے آگئے جو کا یار نہ سر کبھی
اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا!
دیکھا اٹھا کے آنکھ تو دروازہ دور تھا

بقولِ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ جوہر کی شاعری ان کے قلب کی زبان اُن کے جذبات کی ترجمان اُن کے واردات کا بیان ہے۔ آورد و تصنع و تکلف کا اُن کے ہاں گذر نہیں اُن کے قلب پر جو کچھ گذرتی رہتی ہے۔ وہ بے تکلف زبان قلم پر آجاتی ہے۔ اپنی سیرِ باطنی میں وہ جن مقامات و منازل سے گزرتے رہتے ہیں۔ الفاظ موزوں میں انہیں کا عکس ان کی زبان کھینچدیتی ہے۔ تاثیر اس طرزِ سخن کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور یہ وصف ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ان کا معشوق تمام تر مزخرفات سے ارفع و منزہ ہے۔ ان کا معشوق زندہ جاوید ہے۔ فانی نہیں باقی ہے۔ بیدادگر ستم پیما نہیں رحمان و رحیم ہے۔ والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ (اہل ایمان معشوق حقیقی پر دل و جان سے نثار رہتے ہیں)

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت و دنیا — سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے
اللہ ہی کے رستہ میں جو موت آئے تو اچھا — اکسیر یہی ایک دعا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
انعام کا عقبیٰ کے تو کیا پوچھنا جوہر — دنیا میں اس ایماں کا صلہ میرے لئے ہے

ہم عیشِ دو روزہ کے کبھی منکر نہیں لیکن — ایمائے شہ کرب و بلا اور ہی کچھ ہے
خود خضر کو شبیر کی اس تشنہ لبی سے — معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے
اس شانِ تمرد سے نہ کھانا کہیں دھوکا — اللہ کے مجرم کی سزا اور ہی کچھ ہے
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی — پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا سحر
حق کے عقدے اب کہیں مجھ پہ کھلے

اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے
ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

معراج کی اب حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ ہیں تاہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درود دل کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

شیطان کی چالوں سے اب ہو گئے ہیں سب واقف
اب ہونگی الم نشرح ملعونوں کی سب گھاتیں

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

خود کردہ ہے ازل سے تجلیٔ طور کی
جھپکے کی آنکھ کیا تری تلوار دیکھ کر

یہ شانِ امتیاز تو دیکھو کہ اہلِ کفر
مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر

آسان بلندیوں سے ہیں بیزار اہلِ عشق
چھانٹا یہ مرحلہ بھی ہے دشوار دیکھ کر

تیرِ نگہ نے کر دیا دونوں کا فیصلہ
باہم دل و جگر میں یہ تکرار دیکھ کر

یہ کیا کہ سجدہ گاہ ہے ہر سنگِ آستاں
گھسنا جبیں کو چاہئے خسارہ دیکھ کر

یوں بچ سکا مواخذۂ حشر سے تو ہاں
مارا دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور

آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

مسلم اصل ہے دور نہیں روزِ کربلا!
رہتا نہیں برات میں دولہا دلہن سے دور

اللہ رے نورِ چشم محبت کی جستجو!
نکلا اسیرِ مصر نہ کچھ بھی وطن سے دور

ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

تاویل پڑھ کے اقرب الکفر ہو گئی
کچھ بھی نہیں ہے شیخ ترے علم و فن سے دور

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے
خضر کیا جانیں بھلا راہنمائی کے مزے

کثرتِ شوق سے تھا ہجر میں بھی رنگِ وصال
ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے

طبعِ آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی
قید میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے

میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں
بندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے

کثرتِ شوق تھی اور لذتِ بعدِ منزل
ہر طرف خار تھے اور آبلہ پائی کے مزے

سمجھے ہر سجدہ کو معراج جو زاہد چکھ لے
درِ توبہ پہ مری ناصیہ سائی کے مزے

آ گئی وادیٔ پرخار بڑھاؤ تو قدم
پھر نہ کہنا نہ ملے راہنمائی کے مزے

شعرِ جوہر کی ہو کیا قدر شبکساروں میں!
ہم سے پوچھے کوئی اس ہرزہ سرائی کے مزے

یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ

ہوں لاکھ نظر بند دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدقِ طلب بھی تو اثر آہ رسا دیکھ

خو تیری ادا روزہ مرا ایماں ہے ازل کا
پابندِ جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ

عقبیٰ تو کہاں واں نہیں دنیا کا بھی کچھ ٹھیک
اس کافرِ بے فیض سے دل تو بھی لگا دیکھ

ہے سنتِ اربابِ وفا صبر و توکل! / چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ
دشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تو! / بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ
اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے / قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی / ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسانِ بہشت / ہے کفن سرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی
اے اجل تجھ سے بھی کیا خاک رہیگی امید / وعدہ کر کے جو ترا روز مکرنا ہے یہی

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

دورِ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد / ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد!
قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے / اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
جینا وہ کیا کہ جس میں نہ ہو تیری آرزو! / باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

سینہ ہمارا فگار دیکھئے کب تک رہے / چشم یہ خونابہ بار دیکھئے کب تک رہے
عشق سو وہ بھی ترا صبر طلب ہے بہت / صبر ہمارا شعار دیکھئے کب تک رہے
حق کی کمک ایک دن آ ہی رہے گی ولے / گرد میں پنہاں سوار دیکھئے کب تک رہے
یوں تو ہے ہر سو عیاں آمدِ فصلِ خزاں / جور و جفا کی بہار دیکھئے کب تک رہے
دین پہ دنیا نذر کرتے رہے ہم مدتوں! / کفر پہ ایمان نثار دیکھئے کب تک رہے
پہلے رہا دردِ دل مونسِ جاں مدتوں / دردِ جگر اب کی بار دیکھئے کب تک رہے
[illegible] ہے آمدِ مہدی تلک / قوم ابھی سوگوار دیکھئے کب تک رہے

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑ دیو اے / تھے نہ ہم اس کے آستانے کے
ایک اک کرکے سب کے سب تنکے / گئے برباد آشیانے کے
کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا / ساتھ ساتھ اپنے آب دانے کے
دیکھئے یہ بھی گردشِ تقدیر / کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال / ہم ہیں باشندے جیل خانے کے
قید میں اور اتنی بے باکی! / سب یہ لچھن ہیں مار کھانے کے

خوگرِ جور یہ تھوڑی سی جفا اور سہی / اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
خوفِ غماز، عدالت کا خطر جان کا ڈر / ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی
عہدِ اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو / تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی
جس نے ہنگامہ عدالت کا تری دیکھا ہو! / اس گنہگار کو اک روزِ جزا اور سہی
کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو! / سیرِ ظلمات کی تھوڑی سی فضا اور سہی
دین و دل جا ہی چکا جان بھی جاتی ہے تو جائے / ترکشِ کفر میں اک تیرِ قضا اور سہی
ربِ عزت کے لئے بھی کوئی رہنے دو خطاب / تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
حکمِ حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم / مالک الملک سے ایماں کی سزا اور سہی
ہم وفاکیشوں کا ایماں بھی ہے پروانہ صفت / شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

تبرکات کے عنوان سے زیبا فیض آبادی جوہر لکھنو میں اپنے حسب ذیل نوٹ کے ساتھ غیر مطبوعہ کلام جوہر لکھتے ہیں وہو ہذا:—

" یہ حضرت خلد آشیاں کا غیر مطبوعہ کلام ہے۔ جو اودھ خلافت کانفرنس فیض آباد کے ایام میں، فرصت کے لمحوں میں اپنے رفیق مولوی مسعود عالم مرحوم کے مکان پر فکرِ صحیح سے نکلکر اوراقِ پریشان

میں رہ گیا تھا۔ اور دوبارہ شرف ملاحظہ تک نہ پہنچا جس کا لفظ لفظ اثر اور تاثر کا خزینہ ہے اور حرف حرف درد و کیف کا گنجینہ۔ پیغام ہے اور بیداری کا پیغام۔ سبق ہے اور عمل کا سبق۔ آہ محمد علی تو نے صاف صاف کہہ دیا۔ "ہستی کو ایک شرارۂ رقصاں بنائے" تیرا یہ اعلان ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اگرچہ تو زندہ نہیں۔

دل کو ہلاک جلوۂ جاناں بنائیے
اس بتکدے کو کعبۂ ایماں بنائیے

طوفاں بنکے اٹھیے جہانِ خراب میں
ہستی کو اک شرارۂ رقصاں بنائیے

دوڑائیے وہ روح کہ ہر ذرہ جاگ اٹھے
اجڑے ہوئے وطن کو گلستاں بنائیے

پھر دیجئے نگاہ کو پیغام جستجو
منزل سے کیوں نظر کو گریزاں بنائیے

آخر تو ختم ہونگی کہیں قید کی حدیں
یوسف کو آپ رونق زنداں بنائیے

پھر اپنے دلمیں کیجئے پیدا کوئی تڑپ
ہر مشکل حیات کو آسان بنائیے

جو ہر اسیریوں کی کوئی انتہا بھی ہے
آزاد اک نظام پریشان بنائیے

رئیس الاحرار کا باشندگان دہلی کو روحانی پیام

کلمۂ حق ہے اگر وردِ زبان دہلی
مٹ سکے گا نہ کبھی نام و نشانِ دہلی

للہ الحمد کشادہ ہے رہ صبر و صلوٰۃ
ہو کے بیخوف پڑھیں راہروانِ دہلی

سر فروشی کیلئے پیر و جواں ہیں تیار
آج رونق پہ ہے کس درجہ دکان دہلی

حق کے آتے ہی ہوا کعبے سے باطل رخصت
چند دن اور ہیں دنیا میں بتان دہلی

رہرو تمھارا عشق کا منزل کو پالیا
اب او دو میکدہ ان مری لوح مزار دے

ہے رشک اک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اللہ کی دین ہے جسے پروردگار دے

محمد علی میدان سیاست میں

چونکہ مضامین نویسی آپ کی طبیعت کا فطری رجحان تھا۔ اس لئے ریاست بڑودہ کی خاموش زندگی سکون کا موجب نہ بن سکی۔ اور آپ نے زمانہ کی حالت پر نظر ڈالی تاکہ اپنے لئے کوئی اور کام پسند کرکے اس کو شروع کریں۔

اس وقت ملک مصائب میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود اپنی غلامانہ زندگی سے تنگ آکر سیاسی ارتقاء کی جانب رُخ کر چکا تھا۔ اور ہندوستان اقتصادی اور سیاسی کشمکش کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے آپ نے اسی جانب توجہ مبذول کی۔ اور چونکہ آپ کی نگاہ حکومت کے طرزِ عمل پر ناقدانہ پڑ رہی تھی۔ اور آپ کا خیال تھا کہ آبائی اور خود اپنی وفادارانہ خدمت کے اثر سے حکومت سے مل کر اس کے موجودہ طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کردیں گے۔ اس لئے آپ نے فیصلہ کیا کہ کامریڈ کے نام سے کلکتہ سے جو اس وقت حکومت ہند کا مرکز تھا۔ ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار جاری کیا جائے جس میں آئینی طور پر مطالبات پیش کیے جائیں۔ چنانچہ بڑودہ سے دو سال کی رخصت حاصل کرکے سیدھے کلکتہ تشریف لے گئے۔ اسی زمانہ میں نواب جاورہ نے وزارت کے لئے آپ کو منتخب کیا۔ اور لفٹنٹ گورنر پنجاب سے سفارش کرائی۔ مگر آپ نے باوجود انتہائی اصرار کے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اور اخبار نویسی میں عمر گزار دینے کا آخری فیصلہ کر لیا۔

کامریڈ کا اجراء

کامریڈ کا پہلا پرچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ ایک صلح کل۔ اتحاد بین الاقوام کا داعی، وطنی انقلابات کا دشمن حکومت کا موید۔ مگر انتظامی کمزوریوں پر آزادی سے نکتہ چینی کرنے والا اخبار تھا۔

کامریڈ نکلا۔ اور بڑی آب و تاب سے نکلا۔ اور آسمانِ صحافت کا خورشید درخشاں

اور نیر تاباں بنکر چمکا۔ اس کے بلند پایہ مضامین کا ڈنکہ بجنے لگا۔ ہر طرف ان کی زباندانی اور معجز بیانی کی دھوم تھی تھوڑی سی مدت میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ماورائے ہندوستان میں شہرت ہو گئی۔ بڑے بڑے جلیل القدر اور نامور انشاء پرداز ان کی قابلیت اور عظمت کے معترف تھے۔ اور ان کے تبحر علمی کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیتے تھے۔ جب تک کلکتہ پائیہ تخت رہا۔ اخبار وہیں سے نکلتا رہا۔

محمد علی دہلی میں

جب ۱۹۱۲ء میں دہلی پایہ تخت بنا۔ اور مرکزی حکومت کے دفاتر دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ ہو چکا۔ اور وائسرائے کا دفتر دہلی منتقل ہو گیا۔ تو مولانا محمد علی بھی اپنا اخبار لیکر دسمبر ۱۹۱۲ء میں دہلی تشریف لے آئے۔

دہلی تشریف لانے کے بعد آپ نے محسوس کیا کہ حکومت سے جو مطالبات کئے جاتے ہیں اس کے لئے تو انگریزی زبان لازمی ہے۔ لیکن پبلک کو اس کے فرائض سے آگاہ اور ذہین الاقوامی ہند کی بنیاد استوار کرنے کے لئے ملک کی مشترکہ زبان اردو میں بھی کوئی آرگن ضرور ہونا چاہئیے اس لئے آپ نے دہلی آکر روزانہ "ہمدرد" کی بنیاد ڈالی۔ جس نے ایک زمانہ تک مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

یہی وہ زمانہ تھا جبکہ بلقان کی سرزمین پر مظالم کے نام سے بیگناہ ترکوں کا خون بہانے کے لئے بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں متحد ہو کر ترکی مقبوضات کے مجسمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور ان کو ہڑپ کر جانے کی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ مولانا کی بے چین طبیعت اس واحد اسلامی حکومت کے اس طرح حصے بخرے کئے جائے کہ نہ دیکھ سکی۔ اور آپ نے ہمدرد کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتایا کہ ان کی خلافت کن مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ اور

اور ان کے بھائی کن مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ آپ کی مضطرب آواز نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کی مالی امداد پر مجبور کر دیا۔ ساتھ ہی مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری نے ہلال احمر مشن کی تنظیم کی جس نے وہاں جاکر قابل قدر خدمات انجام دیں۔

مولانا محمد علی صاحب صرف مسلمانوں ہی کے رہنما نہ تھے بلکہ ہندوستان کے سچے لیڈر اور آزادیٔ وطن کے زبردست حامی بھی تھے۔

یہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ ہمدرد کے اجراء میں ایک حد تک یہ غرض بھی شامل تھی کہ مسلم لیڈروں نے ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھ کر آئندہ اس کے لئے متفقہ آواز بلند کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا یہی وجہ تھی کہ دہلی سے مولانا محمد علی نے "ہمدرد" اور کلکتہ سے مولانا ابوالکلام نے "الہلال" اور مولانا ظفر علی خانصاحب نے لاہور سے "زمیندار" بڑے پیمانہ پر نکالا۔ مگر معلوم نہیں کہ مشیر حسین صاحب قدوائی نے بمبئی سے اخبار نکالنے کا خیال کن وجوہ کی بناء پر ترک کر دیا۔

ہمدرد کا اجراء

ہمدرد کے اجراء میں آپ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے کتابت کے جھگڑوں سے الگ رہنے کے خیال سے نیز مسلمانوں کو عربی حروف سے آشنا کرنے کے لئے بیروتی ٹائپ میں ہمدرد کا اجراء ضروری خیال کیا۔ اور ایک کثیر رقم صرف کر کے بیروت سے ٹائپ منگایا۔ اور پھر ہمدرد چھپنا شروع ہوا اور چونکہ عربی حروف شناس کمپازیٹروں کی کمی تھی اس لئے [illegible] گئے۔ ان کی عدم واقفیت کی بناء پر ٹائپ جلد خراب ہو گیا۔ اور جدید ٹائپ کے لئے پھر اسی قدر روپیہ کی ضرورت تھی جس کی کامریڈ اور ہمدرد کے مصارف کسی طرح اجازت نہ دیتے تھے۔ بالآخر جب خریداروں کی زیادہ شکایتیں موصول ہوئیں کہ اخبار [illegible] کی تجویز کی [illegible] دیں

ہمدرد شائع ہونے لگا جس سے اس کی اشاعت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اور بڑے بڑے بلند پایہ اخبار اس کی مقبولیت کے سامنے ہیچ ہو گئے۔

لیگ کے نصب العین میں تبدیلی

یوں تو مولانا محمد علی صاحب مسلم لیگ کے اولین بانیوں میں سے تھے اور ۱۹۰۶ء سے اس کے ساتھ وابستہ چلے آتے تھے لیکن ابتدائی زمانے میں مسلم لیگ صرف عام انتظامی امور اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا کام انجام دیتی تھی جب تقسیم بنگال منسوخ ہوئی اور نواب وقار الملک بہادر خلد آشیاں میدان سیاست میں نکل آئے۔ تو مولانا محمد علی ان کے دست راست تھے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ سر محمد شفیع تک اپنے خطبہ صدارت میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ لیگ کا نصب العین کامل خود اختیاری ہونا چاہیے

علی گڈھ یونیورسٹی

اگرچہ علی گڈھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کا خیال پرانا تھا۔ اور ۱۸۷۳ء میں جسٹس محمود نے اس یونیورسٹی کی اسکیم بھی تیار کر لی تھی۔ لیکن اس اسکیم کو عملی صورت دینے میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا بہت بڑا دخل تھا جنہوں نے سر آغا خاں کی معیت میں ملک بھر کا دورہ کر کے پینتیس لاکھ روپیہ فراہم کیا اور کالج کو یونیورسٹی بنا کر چھوڑا۔

انجمن خدام کعبہ

جنگ بلقان اور جنگ طرابلس کے نتائج نے مولانا محمد علی کو ایک اور مقصد کی طرف توجہ دلائی جس کو مسلمانان عالم تقریباً بھول چکے تھے۔ اور جس کو اسلام نے بلند آہنگی سے بتایا تھا۔ اور اس کو اسلامی تمدن کا بنیادی رکن قرار دیا تھا جس کو عالمگیر اخوت یا برادری کہ

نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ مولانا محمد علی نے وقت کے لحاظ سے اپنے بڑے بھائی مولانا محمد علی کی معیت میں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کی اسکیم کی کاپیاں نہ صرف ہندوستان بلکہ عربی میں تراجمہ کرا کر مصر و شام فلسطین۔ الجیریا۔ ٹیونس۔ مراکش۔ ریف۔ طرابلس الغرب۔ نجد و حجاز اور عراق عرب تک پہنچائیں۔ اگرچہ یہ انجمن آج خود اپنے وطن میں یعنی جہاں وہ پیدا ہوئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی کس مپرسی سے مردہ ہے۔ لیکن دوسرے ممالک اسلامیہ میں جہاں کی قومیں آج بھی غلامانہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ بہت زوروں پر ہے اور بہت بڑی حد تک عملی جامہ پہن چکی ہے۔

سیل حوادث

دنیا کے واقعات و حوادث طوفان کی طرح اٹھتے اور سیلاب کی طرح آتے ہیں کمزور انسان ہمیشہ سیلاب کی رو میں سطح آب پر بہتے رہتے ہیں۔ زمین پر درختوں کے جھنڈ ہیں جو ہوا سے ہلتے ہیں۔ کنکر پتھر کے ڈھیر ہیں۔ جن کو ٹھوکریں پامال کرتی ہیں۔ خس و خاشاک کے انبار ہیں جن کو آندھی اڑا لے جاتی ہے۔ اسی طرح انسان ہے جو اگرچہ متحرک ہے۔ صاحب قوت اور طاقت ہے۔ لیکن جب حوادث امنڈ تے ہیں۔ واقعات و تغیرات پیش آتے ہیں تو ضعیف البنیان انسان اپنی تمام طاقتوں اور قوتوں کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ مصائب اور مشکلات کے مقابلہ سے درماندہ ہو جاتا ہے پھر درخت کی طرح گر کر پتھر کی طرح لڑھک کر خس و خاشاک کی طرح آناً فاناً بہہ جاتا ہے لیکن بہادر انسان سیلاب کی رو میں نہیں بہتے۔ وہ مشکلات اور تکالیف کا مقابلہ کرتے۔ مصائب کے طوفان میں تکالیف کے سیلاب میں پہاڑ کی طرح جمے رہتے ہیں۔

ثابت قدمی حق و صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات و موانع حائل ہوتے ہیں۔ حکومت ہند ان کے سیاسی مشاغل سے خائف تھی اس لئے

وہ تشدد پر عامل تھی۔ گرفتاری اور نظربندی معمولی بات تھی۔ حوادث عالم کا سیلاب اگرچہ نہایت مہیب اور ہوشربا تھا۔ بہت مشکل تھا۔ کہ اس کے سامنے ارادہ اور فیصلہ کی دیواریں قائم رہتیں۔ لیکن اس بہادر انسان نے اس وقت بھی اپنے عزم اور ارادہ کو استوار رکھا۔ مصیبت کی سیاہ راتوں میں ظلم وستم کی بے پایاں سیلاب میں ان کے دل پر ایک لمحہ کے لئے مایوسی نہ ہوئی۔ وہ جس منزل پر پہنچنا چاہتے تھے مردانہ وار قدم بڑھائے جاتے تھے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی جاسکتی ہیں جیل کی تاریک اور سیاہ کوٹھڑی میں بند کیا جاسکتا ہے۔ نظربندی اور زباں بندی کی جاسکتی ہے۔ واقعات کی المناکی دل کو چیر سکتی ہے۔ حوادث کی غمگینی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرسکتی ہے۔ لیکن وہ چیز جو اس کے ریشہ ریشہ میں بسی ہوئی تھی۔ وہ صرف اس وقت نکل سکتی تھی۔ جب دل ہی سینے سے نکل جائے کسی کے ظلم ناروا سے کس طرح نکل سکتی ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ تشدد کے باوجود بھی وہ اسی طرح آزادی کا ترانہ سناتا رہا یہ ہے شعر ہر جگہ میں ہوئے دل کے رہی

آدمی پھر قید کیا آزاد کیا

حادثہ فاجعہ مسجد کانپور

۳ اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور کی مسجد کے انہدام کا المناک حادثہ پیش آیا۔ حکومت نے سڑک بنانے کی خاطر متولیان مسجد کو رضامند کرکے وضوخانے کو (جو سڑک کے بیچ میں پڑتا تھا) گرادیا جس سے سارے ملک میں ایک ہیجان برپا ہوگیا۔ آپ نے اس کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔ اور جب شنوائی نہ ہوئی۔ تو آپ سید وزیر حسن صاحب کو لیکر انگلستان پہنچے اور اراکین حکومت سے ملکر لارڈ ہارڈنگ کو ہدایت بھجوائی۔ اور بالآخر بڑی جانکاہی اور عرقریزی کے بعد موصوف کی کوشش سے مسلمانوں کی مرضی کے مطابق اس معاملہ کا فیصلہ ہوگیا۔

جنگ عظیم اور نظر بندی

۱۹۱۴ء میں جب مولانا محمد علی کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے تھے۔ کہ یک بیک یورپ کا محاربہ عظیم شروع ہو گیا۔ اور اس میں ترکی کو برطانیہ کے خلاف جرمنی کے ساتھ شامل ہونا پڑا۔

لندن ٹائمز نے ایک مضمون میں ترکی کو مشورہ دیا کہ جنگ میں بالکل غیر جانبدار رہے۔ اور یونان تک پر بھی حملہ نہ کرے۔ یہ مضمون نہایت غیر معتدل۔ غیر مدلل بلکہ اشتعال انگیز تھا۔ مولانا محمد علی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے کامریڈ میں "ترکوں کی پسند" کے عنوان سے اس مضمون کا نہایت دندان شکن اور بے انتہا مدلل جواب دیا اور اس مضمون کا ترجمہ[۱] ہمدرد میں بھی شائع ہوا۔ اس پر حکومت ہند کے ارباب حل وعقد بے حد پریشان ہوئے اور یہ خیال کرنے لگے کہ مولانا، ملک معظم کے دشمنوں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ کامریڈ اور ہمدرد کی ضمانتیں ضبط کر لیں۔ اور حکومت کی طرف سے تشدد پر تشدد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا قصبہ مہرولی (مضافات دہلی) میں نظر بند کر دیئے گئے۔ ہندوستان بھر میں اس ناواجب نظر بندی کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اور مولانا اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی صاحب خادم کعبہ کے ساتھ مہرولی سے چھندواڑہ بھیج دیئے گئے۔

حکومت کا مطالبہ عہدنامہ

چونکہ سارا ملک مولانا کی نظر بندی کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔ اس لئے حکومت نے ۷ ستمبر ۱۹۱۷ء کو مسٹر عبدالمجید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو شملہ سے [illegible] بھیجا۔ آپ نے سرچارلس کلیولینڈ کی طرف سے ایک عہدنامے کا مسودہ پیش کیا۔ اور کہا کہ اگر [illegible] اس پر دستخط

۱؎ حضرت محمد علی کے دوسرے حصہ "درس آزادی" میں یہ ترجمہ درج ہے

کر دیں۔ تو آپ پر نظر بندی کی قیود اٹھالی جائیں گی۔ اس عہد نامے میں لکھا تھا کہ ہم جنگ کے دوران میں کوئی ایسی حرکت نہ کریں گے جس سے ملک معظم کے دشمنوں کو امداد پہنچے۔ یا ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ نہ ہم ملک معظم کے اتحادیوں کے خلاف کوئی حملہ کر سکیں گے۔ اور نہ کبھی ایسی تشدد آمیز یا غیر آئینی شورش میں حصہ لیں گے جس سے امن عامہ پر مضر اثر پڑتا

بی اماں کا جذبۂ ایمانی

جب مسٹر عبد المجید ان دونوں بھائیوں سے اس عہد نامے کے متعلق گفتگو کر رہے تھے تو بی اماں مرحومہ پردے کے پیچھے کھڑی سن رہی تھیں۔ آپ حکومت کی یہ تجویز سنکر بیتاب ہو گئیں اور ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ کر کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اور مسٹر عبد المجید سے کہنے لگیں۔ کہ اگرچہ تم میرے بیٹوں کو بہت بلند پایہ حکیم سمجھ کر ان کی تعظیم دیکھتے ہو لیکن اگر یہ کسی ایسے عہد نامے پر دستخط کریں گے۔ اور مخلوق کی ایسی اطاعت کریں جس میں خالق کی معصیت ہوتی ہو۔ تو میرے بوڑھے ہاتھوں میں اتنی طاقت ابھی تک ہے۔ کہ میں ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں۔

اسلام سے والہانہ عقیدت

دونوں بھائیوں نے حکومت کے نام ایک اعلان لکھا جس میں بیان کیا کہ ہم نے کبھی کسی تشدد آمیز یا غیر آئینی شورش میں حصہ نہیں لیا ہے۔ نہ لیں گے ہم ہر ایسے عہد نامے پر دستخط کر دینے کو تیار ہیں لیکن ہماری شرط اتنی ہے کہ اس عہد نامے سے ہماری اس اطاعت احکام الٰہی پر کوئی اثر نہ پڑے۔ جو ہمیں دین اسلام سے وابستہ ہونے کے سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحریر سے ارباب حکومت مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ مولانا مسعود مظفر نگر سے بلکہ ایک دفعہ جب چھندواڑہ میں نماز جمعہ کے بعد مولانا نے ملت اسلام اور اسلامی ممالک کی حمایت میں ایک تقریر کی تو حکام نے آپ کی نظر بندی کو موقوف کر کے آپ کو بیتول جیل میں از روئے دفعہ ۳ قانون تحفظ ہند بھیج دیا۔

نظر بندی اور لیگ کی صدارت

۱۹۱۸ء میں جب مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا ہے۔ تو اس وقت مولانا اس کی صدارت کے لئے منتخب ہوئے لیکن نظر بندی کی حالت میں آپ صدارت نہیں فرما سکے۔ آپ کی کرسی خالی رہی اور اعزازی طور پر پہلے آپ کی شبیہ مبارک آپ کی قائم مقام ہوئی اور فرائض صدارت کی انجام دہی مہاراجہ صاحب محمود آباد نے کی۔ اس کیفیت کا اظہار مولانا نے اپنی سرگذشت میں کسی قدر تفصیل سے فرمایا ہے۔

مولانا کی رہائی اور امرتسر کانگریس

جب جنگ یورپ ختم ہو گئی۔ اور ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اعلان شاہی کے ماتحت نظر بند رہا کر دیئے گئے۔ تو علی برادران کی رہائی کا بھی حکم صادر ہو گیا۔ تمام ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک خوشیاں منائی گئیں۔ علی برادران سیدھے امرتسر پہنچے۔ جہاں کانگریس اور لیگ کے اجلاس ہو رہے تھے۔ لاکھوں عقیدت مند انسانوں نے ان شیران بیشہ وطن کا عظیم الشان استقبال کیا۔ اور امرتسر میں ایسا جلوس نکالا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مولانا محمد علی نے کانگریس میں حکومت سے سر مائیکل اوڈوائر کے واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ اور نہایت زبردست تقریر کی۔

مسلم لیگ کے اجلاس میں آپ نے مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات کو قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ مولانا حکومت کی انتہائی مخالفت کے باوجود ہر وقت تعاون پر آمادہ تھے۔

علی برادران کے شدید مالی نقصانات کے پیش نظر اہل وطن نے ایک بہت بڑی رقم کی تھیلی ان کی خدمت میں پیش کرنی چاہی لیکن انہوں نے کہا کہ ہم بہت ہی غریب و نادار ہیں لیکن قوم سے روپیہ قبول نہیں کر سکتے یہ روپیہ رفاہ عام کے کاموں پر صرف کیا جائے۔

مولانا کی نظر بندی سے ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا رنجیدہ تھا۔ جب آپ کی رہائی ہوئی تو ہندوستان کے طول و عرض میں یہ خبر انتہائی مسرت کے ساتھ سنی گئی۔ مگر مولانا مع اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کے امرت سر کی کانگریس میں چلے گئے۔ وہاں سے جب وہ آگئے اور ملک میں دورہ کیا تو جہاں جہاں آپ جاتے تھے وہاں انتہائی مسرت سے جلوس نکالا جاتا تھا۔ اور آپ کا شاندار خیر مقدم ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ کا روزنامچہ جو نقیب بدایوں نے شائع کیا ہے اس کی نقل بجنسہٖ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

روزنامچہ علی برادران

یکشنبہ ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء صبح کے وقت ایک روش پر جس کے چوبیس چکر ایک میل کے برابر ہوتے تھے۔ چار پانچ میل کی مسافت طے کر لینا جیلخانہ میں مولانا شوکت علی صاحب کا معمول تھا۔ ورزش صبح گاہی ہو رہی تھی۔ تقریباً تین میل کا چکر ہو گیا تھا۔ کہ بیتول کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر صاحب بہادر نے انگریزی میں رہائی کی خوشخبری سنائی۔ قیدخانہ سے غالباً اس خبر کو شہر میں ہوا اڑا لے گئی۔ دروازہ پر اژدہام جمع ہو گیا۔ اور اصرار ہوا کہ علی برادران کو فوراً باہر آنا چاہیے۔ جیلر صاحب موجود نہ تھے۔ اور برادران موصوف اسباب باندھنے میں مصروف تھے۔ اصرار سے تنگ آ کر دس بجے کے قریب باہر نکلے اور جلوہ دکھا کر پھر اندر چلے گئے۔ شہر میں ایک صاحب کی شادی تھی۔ پوری برات کی برات پیشوائی کے لیے آگئی۔ ایک بجے کے قریب جیلخانہ کو خیرباد کہا اور ڈھیڈوں کی بارش میں مسجد تک پہنچے۔ جہاں فریضۂ ظہر ادا کیا۔ بعد نماز عقد نکاح میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ پھر مرحوم جیلر کی قبر پر ہوتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔ ریل سے پہلے ہر اسٹیشن پر خود بخود رہائی کی خبر پہنچ رہی تھی

اٹارسی کے اسٹیشن پر خوش آمدید کہنے کے لئے مجمع کثیر منتظر تھا۔ جھانسی کے اسٹیشن پر بڑے جوش و احتشام کے ساتھ استقبال ہوا۔ چونکہ یہاں سے بمبئی میل سے سفر کرنا تھا اس لئے قریباً ایک گھنٹہ قیام کیا۔ آگرہ اور متھرا کے جن احباب کو خبر ہو گئی تھی۔ وہ سیدھے اسٹیشن پہنچے اور تحفہ عقیدت پیش کر کے افواہ کی تصحیح کر گئے۔

دوشنبہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۱۹ء دہلی پہنچنے کی بذریعہ تار اطلاع دیدی گئی تھی۔ استقبال جس جوش و خروش سے ہوا۔ اس کا اندازہ محض اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ پلیٹ فارم پر پھولوں کی تہ پر تہ جم گئی تھی۔ اور ڈاک گاڑی کو چار و ناچار دو گھنٹے اپنے مقررہ وقت سے زیادہ ٹھہرنا پڑا۔

سہ شنبہ ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۹ء جالندھر کے اسٹیشن پر بھی مشتاق زیارت احباب جمع تھے۔ امرتسر میں جس شان سے جلوس نکلا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسٹیشن سے کانگریس پنڈال میں پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت جنرل ڈائر پر اظہار نفرت کا رزولیوشن پیش تھا۔ حاضرین کے اصرار سے برادران موصوف پریسیڈنٹ کی میز پر کھڑے کئے گئے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے پنڈال میں تشریف لے گئے اور نعرہ ہائے اللہ اکبر نے قیامت برپا کر دینے والے شور کے ساتھ استقبال کیا۔

چہار شنبہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء شب کو خلافت کانفرنس میں مولانا شوکت علی صاحب نے صدارت کی۔ اس جلسہ میں مالک حقیقی احکام قرآنی ہندو سندوں کی زبان سے پہنچا رہا تھا۔

پنجشنبہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء باشندگان لاہور امرتسر سے آنے والی ہر ٹرین پر منتظر ورود تھے مگر مسٹر گھاٹے سے یہ معلوم کر کے کہ ان کا قصد یہاں آنے کا نہیں ہے فوراً پانچ موٹریں امرتسر بھیجی گئیں اور دعوت قبول کرنے کے لئے اصرار کیا۔ جناب مولانا عبد الباری صاحب ساتھ تھے۔

جمعہ ۲ر جنوری ۱۹۲۰ء جمعہ کی نماز شالامار باغ میں پڑھی۔ جلوس قابل دید تھا۔ قومیت قدم قدم پر قربان ہو رہی تھی۔ انار کلی کا راستہ چھ گھنٹے میں طے کیا۔ اسی شب کو دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ سہارنپور کے اسٹیشن پر جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کا تار ملا جو اہالیان دہلی کی طرف سے دیا گیا تھا کہ "دہلی ابھی اپنے حسب شان استقبال کے لئے تیار نہیں ہے۔ آٹھ یا نو تاریخ کو قدم رنجہ فرمائیے گا" یہ تار پاکر رامپور کا ارادہ کیا۔

شنبہ ۳ر جنوری ۱۹۲۰ء غازی آباد پر خیر مقدم نہایت تپاک سے کیا گیا اور حاضرین باصرار تمام جلوس کے ساتھ شہر میں لے گئے جہاں انہوں نے مختصر تقریر بھی کی۔

یکشنبہ ۴ر جنوری ۱۹۲۰ء رامپور کے اسٹیشن پر نہایت شاندار استقبال کیا گیا اور جلوس نکالا گیا۔ اسٹیشن سے سرکار (ہز ہائی نس نواب صاحب) کی خدمت میں پہنچے اور ۵ و ۶ و ۷ جنوری تک رامپور میں قیام رہا۔ اس عرصہ میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے یہاں بزم میلاد منعقد کی گئی جس میں بیرونجات سے احباب مدعو کئے گئے تھے۔

پنجشنبہ ۸ر جنوری ۱۹۲۰ء سہ پہر کو ہز ہائی نس سے رخصت ہو کر سرکاری موٹر میں مراد آباد پہنچے۔ شاندار جلوس نکالا گیا۔ ہندو بھائیوں نے پارٹی دی مسجد میں وعظ ہوا۔ رات کی گاڑی سے دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

جمعہ ۹ر جنوری ۱۹۲۰ء علی الصباح ہاپڑ کے اسٹیشن پر لوگوں کی آواز اور باجے کے شور نے بیدار کیا۔ چائے پیش کی گئی۔ اسٹیشن پر خاصہ مجمع تھا۔

غازی آباد پر علی برادران والاقدر ریل سے اتر کر بذریعہ موٹر دہلی تشریف لے گئے۔ ۱۱ بجے کے قریب چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر کے پاس "آزادی کا جہاز" آغوش پھیلائے

کھڑا تھا۔ سڑک پر دو رویہ دوکانوں، چھتوں اور بجلی کے ستونوں پر آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا سب سے پہلے ڈاکٹر انصاری صاحب نے جناب حاذق الملک حافظ حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی شرکت سے معذوری کا خط سنا کر خیر مقدم کیا۔ پھر جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے باشندگان دہلی کی طرف سے ایڈریس پیش کیا۔ اور اشرفیوں کے ہار پہنائے گئے۔ برادران عالیشان نے دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے ہوئے ایڈریس کا جواب دیا۔

بعد نماز جمعہ جلوس نکالا گیا۔ دہلی دُلہن بنی ہوئی تھی۔ جلوس چاوڑی۔ حوض قاضی۔ لال کنواں اور فتحپوری ہوتا ہوا ٹمیا محل واپس آیا۔ شام ہو گئی تھی۔ لہذا فٹن چھوڑ کر بذریعہ موٹر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ اور بعد عشاء تمام شہر میں روشنی کی سیر کی۔

شنبہ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۰ء حمام تشریف لے گئے۔ خوشنویسوں کا ایڈریس لیا۔ حضرت محبوب الٰہی رح کے مزار مبارک پر فاتحہ کے لئے گئے۔ شام کو حاجی عبد الغفار صاحب کے ہاں دعوت تھی اس کے بعد لاہور روانہ ہوئے۔

یکشنبہ ۱۱ر جنوری ۱۹۲۰ء لاہور پھر آغوش پھیلائے ہوئے منتظر تھا۔ خلافت ڈیپوٹیشن کانفرنس کا افتتاح کیا۔

دوشنبہ ۱۲ر جنوری ۱۹۲۰ء لاہور میں حضور وائسرائے بہادر کا تار پہنچا کہ "خلافت ڈیپوٹیشن کے ایڈریس کی نقل پہلے سے آنی چاہیے۔ اغلب یہ ہے کہ ۱۷ر تاریخ کو حضور وائسرائے بہادر وفد کو شرف باریابی بخشیں گے۔ اس لئے فوراً دہلی کو معاودت کی۔ ۱۳ر جنوری کو دہلی آکر ایڈریس لکھا۔ اور جب ایڈریس کا مسودہ تیار ہو گیا تو ۱۴ر جنوری سنہ کو بذریعہ موٹر میرٹھ تشریف لے گئے۔ جہاں عظیم الشان جلوس نکالا گیا۔ اور ۱۵ر جنوری سنہ ء کو میرٹھ سے بذریعہ موٹر دہلی تشریف لائے۔

جمعہ ۱۶ر جنوری ۱۹۲۰ء دہلی میں قیام اور ڈیپوٹیشن کے متعلق تجاویز مشورہ، شام کو مولانا ابو الکلام صاحب آزاد کی تقریر ہوئی۔ بعد مغرب

معلوم ہوا کہ ڈیپوٹیشن ۱۹۔تاریخ کو پیش ہو گا۔

شنبہ ۱۷ر جنوری ۱۹۲۰ء حاذق الملک بہادر کے ہاں سہ پہر کو اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر شام کو ایڈریس کے متعلق بحث و مباحثہ ہوا۔

یکشنبہ ۱۸ر جنوری ۱۹۲۰ء دوپہر کو حاجی میاں جان صاحب کے ہاں بلیماروں میں دعوت ہوئی۔اور شام کو "یادگاران شہیداں" کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور

۱۹۔جنوری ۱۹۲۰ء کو ڈیپوٹیشن والسرائے بہادر کے حضور میں پیش ہوا۔

شنبہ ۲۰ر جنوری ۱۹۲۰ء حسب الطلب ہز ہائی نس جناب نواب صاحب بہادر رامپور تشریف لے گئے اور رات کی گاڑی سے کانپور روانہ ہو گئے

چہارشنبہ ۲۱ر جنوری ۱۹۲۰ء راہ میں لکھنؤ اسٹیشن پر خیر مقدم کیا گیا۔ برادران موصوف فرنگی محل تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس آکر کانپور پہنچے جہاں تزک و احتشام کے ساتھ جلوس نکالا گیا۔رات کو براہ لکھنؤ رامپور واپس آگئے۔

۲۲ر جنوری کی شب کو حسب الطلب مہاتما گاندھی لاہور تشریف لے گئے اور ۲۳ر جنوری بروز جمعہ لاہور سے میرٹھ تشریف لائے۔

شنبہ ۲۴ر جنوری ۱۹۲۰ء میرٹھ سے بذریعہ موٹر ہاپوڑ پہنچے۔ ایک گھنٹہ کے بعد موٹر میں خورجہ تشریف لے گئے اور وہاں سے بذریعہ ٹرین علیگڈھ پہنچے۔ یہاں نہایت شاندار جلوس نکالا گیا۔

۲۵ر جنوری ۱۹۲۰ء علیگڈھ میں جلسہ ٹرسٹیان میں شرکت کی۔ اور کرکٹ کلب کی دعوت میں شریک ہوئے۔ جامع مسجد میں جہاں تقریباً بیس ہزار کا مجمع تھا۔ اور پھر سندر میں تقریریں کیں۔

دوشنبہ ۲۶ر جنوری ۱۹۲۰ء بذریعہ موٹر ایک گھنٹے کے لئے خورجہ جا کر پھر علیگڈھ واپس آئے۔ اور مسلم یونیورسٹی کی مٹنگ میں شرکت کی۔ اور

"ام الاحرار" (بی اماں) کے ساتھ زنانہ خلافت ڈیپوٹیشن کے جلسے میں رونق افروز ہوئے۔ شام کو جناب عامر مصطفےٰ خاں صاحب کے یہاں دعوت تھی جس میں جناب موصوف کے سب ملازمین اور کارندوں نے خلافت ڈیپوٹیشن کے لئے چندہ جمع کرکے پیش کیا۔

سہ شنبہ ۲۷ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء صبح چار بجے ڈاک گاڑی سے لکھنؤ کے لئے علیگڈھ کو خیرباد کہا۔ اٹاوہ اور کانپور کے اسٹیشن پر احباب نے گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔

لکھنؤ میں استقبال جس طرح ہوا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ جلوس جوش وخروش کے ساتھ براہ امین آباد۔ مولانا عبدالباری صاحب کے دولت خانہ تک گیا۔ جہاں علی برادران فروکش ہوئے۔ شام کو رفاہ عام میں عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں دونوں بھائیوں نے تقریریں کیں۔ شب کو مولانا عبدالباری صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ تقریباً چارسو مہمان موجود تھے۔ مولانا صاحب نے عربی میں تقریر کی اور آنریری طالب علمی کی سند عطا فرمائی

۲۸ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء براہ کانپور بمبئی کو روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر رخصت کرنے کے لئے جم غفیر موجود تھا۔ محمد علی صاحب معہ اپنے پرائیویٹ سکرٹری حسن محمد حیات صاحب، سید حسین صاحب سابق ایڈیٹر انڈی پنڈنٹ اور جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی یکم فروری سنہ ۱۹۲۰ء کو ولایت تشریف لے گئے۔ اور مولانا شوکت علی صاحب معہ اپنے پرائیویٹ سکرٹری اشفاق علی صاحب واختر علی صاحب ہندوستان واپس آکر خلافت ڈیپوٹیشن کے لئے فراہمی چندہ کی غرض سے دورہ کریں گے۔"

ٹرکی۔لائڈ جارج اور محمد علی

جنگ کے دوران میں مسٹر لائڈ جارج نے ہندوستانی مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا۔ کہ ٹرکی کی حیثیت برقرار رکھی جائے گی۔ اور ایشیائے کوچک تھریس۔ سمرنا پر ہرگز قبضہ نہ کیا جائے گا۔ لیکن جنگ کے خاتمہ پر یہ وعدہ توڑ دیا گیا۔ اور اسلامی علاقے پائمال کر دیئے گئے اس پر تمام مسلمانان ہند غیظ و غضب سے آگ ہو گئے۔ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں سے ہمدردی کی۔ امرتسر ہی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ حمایت خلافت کی تحریک شروع کی جائے اور اس کے رہنما مہاتما گاندھی ہوں۔

جمعیۃ خلافت کی بنیاد

یوں تو جمعیۃ خلافت کی بنیاد اسی وقت پڑ چکی تھی جب علی برادران چھندواڑہ جیل سے رہا ہو کر کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شریک ہونے کیلئے امرتسر تشریف لے گئے تھے اور وہیں حمایت خلافت اسلامیہ کی تجویز بھی پاس ہو گئی تھی۔ جب مرحوم کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ حکومت برطانیہ اپنے مواعید پورے نہ کرے گی۔ برطانوی وعدے بے حقیقت ہیں اور یہ محض مسلمانوں کے جذبات کو دبانے کے لئے گئے تھے۔ تو اس کے فوراً ہی بعد تحریک خلافت کی تنظیم میں مشغول ہو گئے تمام ملک میں خلافت کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اور موصوف کی ان تھک کوشش اور مسلسل جد و جہد سے قلیل عرصہ میں ہندوستان کے چپہ چپہ میں خلافت کمیٹی کا ایک مضبوط جال بچھا دیا گیا۔ نا انصافی ہو گی۔ اگر تحریک خلافت کے ان عظیم الشان نتائج کے اعتراف میں کوتاہی کی جائے۔ جو خلافت توقع اور گمان تھوڑی مدت میں ظاہر ہوئے۔ آپ نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ اور اپنی مسیحا نفسی اور معجز بیانی سے سارے ہندوستان میں آزادی کی روح پھونک دی۔ مورخین عالم کی صف ایک نئے آنے والے مورخ کی راہ تک رہی ہے وہ آزادی ہند کا مورخ ہو گا۔ جب مورخ کا قلم اٹھے گا۔ اور وہ ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا۔

اسے اعتراف کرنا پڑیگا۔ کہ ہندوستان اپنی آزادی کے لئے کسی جماعت کا اس قدر رہین منت نہیں رہا ہے۔ جس قدر بانیٔ خلافت اور پیروانِ اسلام علی برادران کا۔

وفد خلافت انگلستان میں

سنہ ۱۹۲۰ء میں جبکہ امیدوں اور آرزوں کی پوری دنیا الٹ چکی تھی۔ مسلم رہنماؤں کی تمام کوششیں اور جد وجہد ختم ہو چکی تھی۔ اور خلافت اسلامیہ پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ عہدنامہ سیورے ہو چکا تھا۔ اور مسلمانوں کی رہی سہی امید کا بھی خون ہو گیا تھا۔ عہدنامہ سیورے کو معتدل بنانے کی غرض سے مولانا محمد علی سرکردہ ہندوؤں کی معیت میں مسلمانوں کا ایک وفد لیکر وائسرائے کے پاس پہنچے۔ اور تحفظ خلافت کا مطالبہ پیش کیا لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے بعد قرار پایا۔ کہ حجاز۔ سمرنا۔ عراق عرب۔ مصر اور ایران میں وفود خلافت بھیجے جائیں لیکن حکومت ہند نے پروانہ ہائے راہ داری دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد مولانا محمد علی نے مرکزی خلافت کمیٹی کی مدد سے ہندوستان میں تحریک خلافت کو منظم کیا۔ اور مارچ سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک وفدِ خلافت زیر سرکردگی مولانا محمد علی انگلستان پہنچا۔ وہاں اکابر سے ملاقاتیں کیں۔ اخباروں میں مضامین لکھے۔ البرٹ ہال اور کنگزوے ہال میں جلسے منعقد کئے لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مولانا محمد علی نے پوپ سے ملاقات کی۔ فرانس میں پروپیگنڈا کیا۔ انگلستان سے "مسلم آوٹ لک" اور پیرس سے لیکو و لا اسلام جاری کرائے۔ تاکہ حمایت خلافت کا پروپیگنڈا کیا جا سکے۔ اس کے بعد مولانا نے مطالبہ کیا کہ انہیں سان ریمو میں سپریم کونسل کے سامنے مطالبات خلافت پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس سے بھی انکار کر دیا گیا۔

تحریک ترک موالات اور ہندو مسلم اتحاد

جب مولانا کا وفد یورپ سے مایوس و ناکام لوٹا۔ تو ہندوستان آتے ہی اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں

آپ نے ایک عظیم الشان جلسے میں تقریر کی جس میں فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملکر اپنے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے ۔ کیونکہ خلافت کا تحفظ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے ۔ ادھر مہاتما گاندھی نے کانگرس میں عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا ۔ ادھر مولانا محمد علی کے اثر ورسوخ سے علمائے اسلام نے ترک موالات کا فتویٰ دیدیا ۔ اور یہ تحریک پوری قوت سے شروع کردی گئی ۔ بہت سے لوگوں نے خطابات ترک کردیئے ۔ بیشمار وکلاء نے پیشۂ وکالت ترک کردیا ۔ ہزارہا طالب علموں نے سکول اور کالج چھوڑ دیئے ۔ مولانا محمد علی نے علی گڈھ یونیورسٹی میں پہنچکر مسلمان نوجوانوں سے اسلام کے نام پر اپیل کی ۔ کہ وہ تعلیم ترک کرکے تحفظ خلافت اور حریت وطن کے لئے کام کریں ۔ ناگپور کانگرس کے فیصلے کے مطابق تلک سوراجیہ فنڈ میں ایک کروڑ روپیہ کی فراہمی کا کام شروع کیا گیا جس میں مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی کے دوش بدوش کام کیا مولانا نے ترک موالات کے علاوہ کھدر اور چرخے کی ترویج کا پروپیگنڈا بھی کیا ۔

علی برادران کا اعتذار

اس تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ سارا ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو گیا ۔ اور ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی سب اس کی لپیٹ میں آ گئے ۔ مولانا محمد علی نے اس تحریک میں ہزارہا تقریریں کیں صدہا دورے کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ سڈیشن اور سول نافرمانی کی وجہ سے تقریباً تیس ہزار سرفروشان من جیل خانوں میں پہنچ گئے اسی دوران میں لارڈ ریڈنگ نے مہاتما گاندھی سے ملاقات کرکے ان سے شکایت کی کہ علی برادران نے اپنی تقریروں میں تشدد آمیز فقرات کہے ہیں اس پر مہاتما گاندھی نے علی برادران سے کہا کہ وہ معذرت شائع کردیں ۔ چنانچہ انہوں نے ایک معذرت شائع کردی جس میں بیان کیا کہ " گو ہمارا مذہب بوقت ضرورت تشدد کا حامی ہے لیکن جب تک ہم مہاتما گاندھی کے ساتھ عدم تشدد کی تحریک میں شامل ہیں ہم اس کے پابند رہیں گے " ۔

لارڈ ریڈنگ کا منشا، تو یہ تھا کہ اس ستم کے اعتذار سے علی برادران غیر ہر دلعزیز ہو جائیں لیکن ان کا خلوص اس قدر بلند مرتبہ رکھتا تھا کہ کسی نے اس کو محسوس بھی نہ کیا بلکہ اہل وطن کی نظروں میں ان کی قدر و وقعت اُن کی اصول پرستی کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی

دوبارہ گرفتاری مقدمہ قید

حکومت مولانا محمد علی کے بناہ حملوں کی تاب نہ لا سکی اور ۱۴-ستمبر ۱۹۲۱ء کو وزیگا پٹم کے مقام پر آپ گرفتار کر لئے گئے۔ اور ۱۶- اکتوبر کو وہ عظیم الشان مقدمہ شروع۔ جسے مقدمہ کراچی کہتے ہیں۔ خالق دینا ہال کراچی میں مولانا محمد علی اپنے چھ رفقا سمیت ملزمین کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ آپ نے اپنے لئے کسی وکیل کی خدمات حاصل نہ کیں۔ بلکہ استغاثہ کے جواب میں ذیل کا معرکۃ الآرا بیان دیا جس میں ملکہ وکٹوریہ کے وعدہ آزادی مذہب کو بناء قرار دیکر ثابت کیا۔ کہ ہم پر مقدمہ چلانا آزادیٔ مذہب کے اصول کے منافی ہے۔ اس لئے خلاف قانون ہے۔

اعلان حق و سر فنا فی اللہ

مولانا محمد علی اور کراچی کی جیوری

مقدمہ کراچی میں جیوری کے سامنے رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے حسب ذیل تقریر فرمائی:-

"حضرات جیوری مجھے اس مقدمہ سے بری ہونے اور سزا سے بچنے کی ذرا فکر نہیں ہے۔ مجھے اس کی فکر نہیں ہے کہ اپنی کوئی صفائی پیش کروں میں کسی قسم کی صفائی پیش نہیں کرتا گو کہ مجھے قانون اسلام کی تشریح محض اس لئے کرنی پڑی کہ آپ کو یہ سمجھا دوں کہ اس مسئلہ کا عدالت میں ہمارے طرز عمل سے کیا تعلق ہے۔ میں نے نہ گواہان ثبوت سے جرح کی۔ نہ ابھی صفائی کی کوئی شہادت پیش کی۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ جو میرے ہموطن ہیں۔ اور

اس وقت حکومت کے ساتھ شریک کار ہیں ایک بات پر غور کرلیں۔ دنیا کی تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ بہت سے مشہور سیاسی مقدمات چلے ہیں جن میں بہت سے بڑے بڑے لوگ مجرم قرار دیئے گئے ہیں۔ خود فرانس کی تاریخ میں غریب جون اف ارک کو جادوگرنی سمجھ کر مارا گیا تھا۔ مگر نتیجہ کیا ہوا؟ فرانس میں میرے ہوٹل کے سامنے اس کا سنہری مجسمہ نصب تھا۔ اور میں جس زمانہ میں وہاں تھا اسی زمانہ میں کیتھولک کلیسا کے اسقف اور پادریوں نے اس مجسمہ کو برکت دی۔ مگر ان لوگوں کے خلاف کیا کیا کیا جنہوں نے جون اف ارک کو زندہ جلایا تھا۔ خود برطانوی فوج نے بھی فرانسیسوں کے ساتھ شریک ہو کر اس کے نام پر خراج تحسین اور آفرین ادا کیا۔ اور اس کے مجسمہ پر پھول چڑھائے۔ ایک ایسے ہی موقع پر میں خود موجود تھا۔ شاہ جارج سوئم کے زمانہ میں جارج واشنگٹن بھی ایک باغی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ مگر آج اس کی نسبت برطانوی حکومت کیا کہتی ہے؟ آج تو اس کو دنیا کا سب سے بڑا محب وطن کہا جاتا ہے۔

میں خاص طور پر ان صاحب سے خطاب کرنا چاہتا ہوں جو جماعت جمہوری میں تنہا ایک ہی انگریز ہیں۔ انگریزوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے اہل ملک کے اکثریت کے قدم بقدم چلیں خصوصاً باطل پرستی اور نااتفاقی میں یقین کیجیے کہ انگلستان کی تمام تاریخ میں اکثر کم تعداد جماعتیں برسر حق رہی ہیں۔ ان ہی جماعتوں نے ہمیشہ عظیم الشان اور نیک تحریکوں کو شروع کیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی عظیم الشان تحریک اکثریت کی طرف شروع نہیں ہوئی۔ پائیلٹ سولی پر نہیں چڑھایا گیا تھا۔ بلکہ مسیح مصلوب ہوئے تھے (ان پر خدا کی رحمت اور برکت ہو جیو)

پائیلٹ خود نوع صاحبیں نے مسیح کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ مگر آج اصل فیصلہ کون دینے والا ہے اور آج کے بعد کون دیگا، در حقیقت خدا ابدیت کے متعلق

اپنا فیصلہ دیگا جس کو معلوم نہ تھا کہ "حق" کیا ہے۔ مگر آج پائیلٹ کہاں ہے۔ اس مسیح کو مصلوب کرنے والے جج کو کون جانتا ہے محض مسیح کے مصلوب کرنے کی وجہ سے ان کا نام مشہور رہے۔ لیکن کروڑوں انسانوں کے لئے مسیح کا نام مصدر سعادت ہے۔"

میری کیا حقیقت ہے کہ مجھ جیسا ناچیز مسیح سے اپنی حالت کا موازنہ کرنے کی جرأت کرے۔ میں تو اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتا کہ مسیح کے نیچے کی خاک بھی چھو سکوں۔ مگر جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

"یہ ضروری نہیں کہ کمزوری ہمیشہ باطل پرستی سے تعبیر کی جائے حق تو حق ہے۔ کم ہو یا زیادہ (جس حد تک بھی ہو) وہ حق جس کو خدا نے اپنی گرجتی ہوئی آواز سے نظرت انسانی تک پہنچا دیا۔ وہ حق جس کو میری روح میرے کان میں کہہ رہی ہے۔"

اس حالت میں جبکہ برطانوی توپیں گرج رہی تھیں۔ ایک ناچیز انسان کی روح نے اس کے کان میں اس حقانیت کا ایک جزو قلیل کہہ دیا۔ جو خدا کی غیر فانی ہمیشہ قائم رہنے والی اور روح کو سہارا دینے والی حقانیت ہے۔ اور وہ یہ کہ ناچیز انسان صریح قانون الٰہی کے خلاف ہاتھ پر ہاتھ رکھکر مسلمانوں کو مسلمانوں کے ہاتھ سے ذبح ہوتے نہ دیکھے۔ بلکہ اس عمل کے خلاف تبلیغ و تلقین کرے اور کلمہ حق کو پھیلائے۔ اس طرح پھیلائے کہ کسی نہ کسی دوسرے انسان کا خوف اس پر طاری ہو نہ وہ دنیوی نتائج سے متاثر ہو۔"

اس کے بعد آپ نے حضرت موسیٰ اور قوم بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

"قرآن میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ ان پر خدا کی برکت و رحمت ہو جیو،

بنی اسرائیل کو مصر سے بخیر وعافیت نکال لائے اور وہ فرعون کے ظلم سے بچائے گئے تو ان سے کہا گیا کہ اب ارض موعودہ کی طرف چلو۔ مگر انہوں نے کہا کہ وہاں تو دیو بستے ہیں۔ "ان فیھا قوم جبارین" جب تک دیو وہاں ہیں ہم تو اس سرزمین پر داخل نہ ہو سکیں گے۔

وان لن ندخلها حتی یخرجو منها فان یخرجو منها فانا داخلون

انا لن ندخلها ابدا ما دام فیها فاذهب انت وربک فقاتلا انا ههنا قاعدون

حضرت یہ مثال وہ ہے جس پر آپ نے ارض مقدس کے متعلق عمل کرنے کے بجائے مجھے حکم دیا ہے۔ کہ اس سے احتراز کروں۔ میں اس قانون کو قبول نہیں کر سکتا میں یہ نہیں کر سکتا کہ "چونکہ اس ارض مقدس پر طاقتور لوگ حکمراں ہیں اگرچہ وہ دیو نہیں۔ اس لئے میں کہہ دوں کہ (تم اور تمہارا خدا جائے اور لڑے۔ ہم یہاں آرام کرتے ہیں) اس موقعہ پر میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس قانون اور اس مثال کے مناسب یا نامناسب ہونے پر بحث کروں جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ قرآن میرا قانون ہے۔ چاہے ارض مقدس پر دیو رہتے ہوں یا کوئی اور میں تو جب میرا خدا حکم دیگا آونگا۔ اور آرام سے بیٹھا نہ رہونگا۔ نہ خدا سے یہ کہوں گا۔ کہ خدا تو خود جا۔ اور دیوں سے لڑ۔ مجھے اگر پھانسی پر بھی چڑھا دیا جائے (اس لئے کہ دفعہ ۱۲۰۔ الف داد سے نہیں بلکہ مجھ پر دفعہ ۱۲۱ یعنی بادشاہ کے خلاف بغاوت کا جرم عائد ہے) اتب بھی حضرات میں تو یہی کہوں گا کہ میرا قانون قرآن ہے۔ اور یہی حق ہے اور مجھے امید ہے کہ میری لاش بھی جب پھانسی پر لٹکی ہوگی تو وہ بھی یہی پکاریگی۔

پس حضرات سب مجھے سزائے حبس دوام بعبور دریائے شور سے بچانے کا تو خیال بھی نہ کیجئے۔ لیکن اگر آپ خدا رکھتے ہیں۔ اور اگر آپ روح رکھتے ہیں جس کو عذاب سے بچانا ہے تو اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ دیجئے۔ آپ کو اس امر پر غور کرنا نہیں ہے

کہ آپ کسی کمپنی کے ملازم ہیں۔ ریلی برادرس کی یونانی کمپنی یا فوربس فوربس اور کیمپل یا محاصل خانہ کے ملازم ہیں۔ آپ کو تو صرف یہ سوچنا ہے کہ آپ خدا کے غلام اور حکم بردار ہیں۔ حضرات بس یہی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ دیجئے۔ مجھے بچانے کی نہیں۔ بلکہ خود اپنے کو (عذاب آخرت سے) بچانے کے لئے۔

جس وقت جج نے میری تقریر پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔" اور چاہا تھا کہ میں تقریر ختم کر دوں۔ تو میں نے ان کو جواب دیا تھا۔ کہ "مجھے ہاتھ کے ہاتھ پھانسی پر چڑھا کر سب تماشے کو ختم کیوں نہیں کر دیتے" سو وہ مسکرا کر فرماتے تھے۔ کہ یہ معاملہ محض میرے اور آپ کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ آپ اور میرے اور پبلک کے درمیان بھی ہے جس پر میں نے پھر کہا تھا کہ پبلک تو اپنا فیصلہ دے چکی۔ اس مکان کے اندر بھی۔ اور سڑکوں پر بھی۔ جہاں ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں اور ہمیں عدالت میں آتے جاتے دیکھ کر نعرے لگاتے ہیں۔ جہاں تھوڑی عورتیں باوجود بے پردگی کے باہر نکل آتی ہیں۔ (جیسا کہ میری ماں نے اس مقدمہ کے شروع ہوتے ہی اپنا پردہ ختم کر دیا۔) اور ہماری بلائیں لیتی ہیں۔

پس حضرات! میری صفائی میرے خدا کے سامنے اور میرے ہموطنوں کے سامنے پیش ہو گی۔ ہم آج عدالت کے سامنے قیدیوں اور ملزموں کی حیثیت سے کھڑے کئے گئے ہیں۔ مگر جس دن خدا کی مسند عدالت کے سامنے جج اور جیوری ملازم اور ان کے شرکاء وکیل سرکار اور ان کے اسسٹنٹ سب لوگ اور خود بادشاہ کھڑے ہوں گے۔ اس وقت خدا سوال کرے گا کہ "لمن الملك اليوم" (آج کے دن یہ ملک کس کا ہے) تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟ آپ کہیں گے کہ اے خدا۔ ملک تیرا ہی تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ عیسیٰ کی سلطنت جو آنے والی ہے۔ مگر حضرات خدا کی سلطنت

تو ہو چکا۔ خدا اور اس کی سلطنت آگئی۔ آج بھی یہاں اس وقت خدا کی سلطنت موجود ہے۔ یہ شاہ جارج کی سلطنت نہیں ہے۔ خدا کی سلطنت ہے اور اسی بنیاد پر آپ فیصلہ دیں۔ اور اسی بنیاد پر مجھے عمل کرنا ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ میں صرف اس حد تک شاہ جارج کے قانون کی تعمیل کرونگا۔ جہاں تک کہ وہ مجھے خدا کے قانون کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہ کریں۔ میرے دل میں ذاتی طور پر بادشاہ کے متعلق کوئی عناد نہیں ہے۔ مجھے جج کے ساتھ بھی عناد نہیں ہے نہ گورنمنٹ کے خلاف۔

حضرات ہم سب کو مفاد عامہ کے مقاصد کو پیش نظر رکھکر کام کرنا چاہئے۔ نہ کہ ذاتی بغض و عناد کی بنا پر۔ ایک دفعہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے داماد۔ عزیز اور جانشین حضرت علی کو ایک یہودی پر غصہ آیا جس نے اسلام اور خدا اور عقائد اسلام کی توہین کی تھی۔ انہوں نے اسی دم اس کو زمین پر گرا دیا۔ اور اس کے سینہ پر چڑھ گئے۔ یہودی نے سمجھا کہ اب وہ قتل کر دیا جائیگا۔ اور بالکل مایوس ہوکر اس نے حضرت علی کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ دودھ کا بھرا برتن جب آگ پر رکھا ہو تو دودھ ابلتا ہے۔ مگر جہاں پانی کا ایک چھینٹا دیا وہ ابال جاتا رہتا ہے۔ یہودی کے تھوکنے سے بالکل وہی حالت پیدا ہو گئی۔ اور کس قدر تعجب انگیز بات ہے کہ اس کی اس حرکت کے بعد حضرت علی کا غصہ فوراً اتر گیا۔ اور وہ اس کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور چل دیئے۔ یہودی کو اس قدر جرأت ہوئی کہ وہ آپ کے پیچھے دوڑا۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ کہ یہ تو عجیب حرکت ہے جب میں نے زبان سے ایک حرف کہا تھا تو آپ نے مجھے گرا دیا اور مار ڈالنے پر تیار تھے۔ اور جب میں نے آپ کے منہ پر تھوکا تو آپ الگ ہو کر مجھے چھوڑ کر چل دیئے۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ تو نے خدا کی توہین کی تھی۔ پس میں تجھے مار ڈالنا

جب تو نے مجھ پر تھوکا تو مجھے خود اپنی توہین کے باعث غصہ آگیا۔ مگر مفاد عامہ ذاتی غصہ کے ساتھ ساتھ نہیں رکھا جاسکتا۔ میں خدا کے واسطے جلاد کا کام کرسکتا ہوں مگر محض علی کے لئے قتل کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔"

حضرات ہم دونوں کے نام کا ایک لفظ علی کا مقدس نام ہے اور میرے نام میں تو ایک دوسرا نام بھی شامل ہے۔ جو علی سے بھی بزرگ تر ہے۔ میں ذاتی عناد کے باعث تو ایک مچھر کو بھی نہیں مار سکتا۔ لیکن اپنے خدا کے واسطے میں سب کو قتل کردوں گا۔ میں کسی کو جان کی امان نہ دوں گا۔ میں اپنے بھائی کو ذبح کر ڈالوں گا اپنی پیاری بوڑھی ماں کو۔ اپنی بیوی کو۔ اپنے بچوں کو سب کو (خدا کی راہ میں ذبح کر ڈالوں گا۔) خدا میری مدد کرے

(جس وقت مولانا نے آخری فقرے ادا فرمائے تو اُن کی آواز بیٹھ گئی تھی آنسوؤں کے قطرے رخساروں پر ڈھلک رہے تھے۔ اور آخر بالکل بے اختیار ہوکر وہ بیٹھ گئے)

جیوری نے آپ کے بیان سے اتفاق کیا۔ اور فوجوں میں بغاوت پھیلانے کے الزام سے آپ کو بری قرار دیا۔ لیکن بعض دوسری اور چھوٹی دفعات کے ماتحت ملزم گردانا۔ چنانچہ یکم نومبر کو آپ اور آپ کے بھائی کیلئے دو سال قید با مشقت کی سزا تجویز ہوئی۔

ہزارہا ہندو اور مسلمان فیصلہ سننے کے لئے جمع تھے۔ انہوں نے سزا کا حکم سُنکر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور یہ مجاہد حریت جیل خانہ کی جانب شاداں و فرحاں روانہ ہوگیا

چھوٹا جیل اور بڑا جیل

اپنی قید کی پوری میعاد گزارنے کے بعد مولانا محمد علی اگست ۱۹۲۳ء میں رہا ہوئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیل میں آگیا ہوں۔ اب میرا پہلا فرض یہ ہے کہ

سوراج کی کنجی تلاش کروں۔ جس سے یرودا جیل کا دروازہ کھولا جا سکے۔ جہاں مہاتما گاندھی مقید ہیں۔" اس کے بعد آپ نے حتی الوسع تحریک کو جاری رکھنے کوشش کی۔

کوکناڈا کانگریس کی صدارت

دو سال کی قید بامشقت کے بعد جب آپ رہا ہوئے تو ملک نے آپ کو وہ اعزاز بخشا۔ جو ہندوستان کی قومیت متحدہ کے نزدیک سب سے بڑا اعزاز ہے یعنی آپ کوکناڈا کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ اگرچہ اس وقت بعض شر پسند ہندو رہنماؤں نے حقیقی قائدین وطن کی غیر حاضری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر شدھی اور سنگھٹن جیسی زہریلی تحریکیں جاری کر رکھی تھیں۔ لیکن مولانا محمد علی نے اپنے طویل خطبۂ صدارت میں مسائل قومی پر اس خوبی و خوش اسلوبی سے اظہار خیالات کیا کہ مایوس قلوب میں پھر امید کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اور قومیت پرست قوتیں پھر منظم ہونے لگیں۔

آل پارٹیز کانفرنس

سنہ ۱۹۲۴ء میں مہاتما گاندھی نے فسادات کوہاٹ اور اتحاد ہندو مسلم میں اپنی ناکامی سے متاثر ہو کر اکیس دن کے برت کا اعلان کیا۔ اور دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اختلافات ہندو مسلم کا فیصلہ ہو جائے تاکہ فسادات اور بلوے بند ہوں۔ اور ملک پھر متحد ہو کر آزادی کے لئے کام کر سکے مولانا محمد علی نے اس کانفرنس میں بے انتہا خلوص۔ سرگرمی۔ ایثار اور محنت سے کام لیا۔ لیکن ہندو مہا سبھائیوں نے ایک نہ چلنے دی۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ بدستور لاینحل رہا۔

کامریڈ اور ہمدرد کا دوبارہ اجرا

اس دوران میں کامریڈ اور ہمدرد دوبارہ جاری ہو چکے تھے۔ لیکن چونکہ مولانا اختلافات ہندو مسلم اور تباہی تحریک حریت سے بے حد مایوس و دل شکستہ ہو رہے تھے اس لئے ان اخباروں کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد یہ دونوں پرچے بند ہو گئے۔

کانگریس کی عدم رواداری اور مایوسی

مذہبی اختلافات نے معرکہ آرائیوں تک ترقی کر کے اُس اتحاد کو جو معراج کمال تک پہنچ چکا تھا قلیل مدت میں عداوت سے بدل دیا۔ جا بجا فسادات ہوئے۔ اقلیت کو برباد کرنے کی ان تھک کوششیں کی گئیں۔ شدھی اور سنگھٹن کی مسموم ہوائیں چلیں مولانا محمد علی جب رہا ہوئے اور یہ حالت دیکھی تو انتہائی صدمہ ہوا۔ اور ان ہنگاموں کے فرو کرنے میں ساعی رہے۔ کانگریس بھی مالوی اور مونجے کے خیالات کی آئینہ دار ہو چکی تھی۔ سوراج کے معنی ہندو راج سمجھے جانے لگے تھے۔ مخلوط انتخابات۔ نظم صوبجات اور حفظ حقوق کے مطالبہ پر ہندو ذہنیت کی مسلسل فریب کاریوں نے مسلمانوں کو برداشتہ خاطر بنا دیا۔

مولانا کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ اور شدت مرض نے علاج کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ ہندوستانی معالجوں کے مشوروں سے مولانا نے یورپ کا سفر اختیار کیا۔ اور جب جرمنی کے ایک شفاخانہ میں صاحب فراش کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے تو مولانا کی خدمت میں نہرو کمیٹی کی وہ رپورٹ پہنچی جس نے ہندو مسلم تنازعات کی خلیج کو ایسا وسیع کر دیا تھا۔ کہ جس کے پاٹنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ مولانا نے

مولانا محمد علی نے باوجود معالج کی سخت ممانعت کے رپورٹ کا مطالعہ کیا۔
اب حالت رو بہ صحت تھی اور مولانا عازم سفر بجائے راہ جہاز اختیار کرنے کے مولانا خشکی کے راستے قسطنطنیہ پہنچے۔ برطانیہ۔ فرانس۔ ہالینڈ۔ بلجیم۔ جرمنی آسٹریا ہنگری۔ جرگو سلافیہ۔ بلغاریہ اور یونان سے گزرتے ہوئے حدود ترکی میں داخل ہوئے اور "ادرنہ درنہ" کے اسٹیشن پر اترے۔ چند روز قیام فرما کر فلسطین اور عراق ٹھہرتے ہوئے کراچی بندرگاہ پر پہنچے۔ سفر کی ان تکالیف سے یقیناً اثر ہونا تھا اور ہوا۔ مولانا پہلے سے زیادہ علیل ہو گئے۔ سفر سے واپس آکر آل انڈیا خلافت کی صدارت فرمائی۔ آپ نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں بھی نمایاں حصہ لیا۔

تجاویز دہلی اور مدراس کانگریس

مولانا دن رات کسی ایسے فارمولا کی تلاش میں رہتے تھے۔ جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد ہو جائے۔ چنانچہ جب وقت مسٹر جناح نے اپنی وہ تجاویز پیش کیں۔ جن کو تجاویز دہلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تو مولانا نے ان تجاویز کو بیحد پسند کیا۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کی قرارداد میں ان کو داخل کر لیا۔ اس کے بعد مدراس کانگریس میں بھی ان کو منظور کرایا۔ گو وہ تجاویز کانگریس میں اپنی اصلی صورت سے منظور نہ ہوئیں۔ لیکن مولانا کی سادگی مصالحت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندوؤں کی تھوڑی سی رواداری پر بھی مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔

نہرو رپورٹ

لیکن جب آل پارٹیز کنونشن کے بعد نہرو کمیٹی نے اپنی رسوائے عالم رپورٹ شائع کی تو مولانا نے یہ دیکھ کر کہ ان کے تمام سابق رفقاء (گاندھی۔ نہرو وغیرہ) نے

مسلمانوں کے حقوق و مفاد کو ٹھکرا کر ہندوستان میں کامل و مکمل ہندو راج قائم کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ تو آپ نے اس کے خلاف نہایت شدید احتجاج کیا۔ اور جس جماعت نے نہرو رپورٹ کے خلاف کام شروع کر دیا تھا۔ اس کو اپنی جلیل القدر شخصیت سے بہت بڑی تقویت پہنچائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہرو رپورٹ ایک ہی سال کے بعد دریائے راوی کے کنارے سپرد خاک کر دی گئی۔

آخری کوشش اور علیحدگی

اگرچہ اب مولانا پر کانگریس کے دراصل ہندو سبھا ہونے کا راز بالکل آشکارا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی آپ نے ہمت نہ ہاری۔ اور ہندوستان کو ایک دفعہ پھر متحد دیکھنے کی تمنا میں لاہور کانگریس کے موقعہ پر مہاتما گاندھی سے ملاقات کی۔ اور ان کو سب نشیب و فراز سمجھا کر کہا۔ کہ مسلمانوں کے حقوق کا صحیح تصفیہ کر دو پھر ہندوستان کی آزادی یقینی ہے۔ لیکن مہاتما جی نے صاف کہہ دیا۔ کہ اب ہمارا نصب العین کامل آزادی ہے۔ ہمارے ساتھ ملکر اس مقصد کو حاصل کرو۔ فیصلے اور تصفیے بعد میں ہوتے رہیں گے۔ یہ سن کر مولانا محمد علی بہت مایوس ہوئے اور لاہور کی خلافت کانفرنس میں مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی۔

آپ ان نام نہاد مسلمانوں میں سے نہ تھے جو مسلمانوں کے بعض طبقات سے محض ان کے سیاسی خیالات کی وجہ سے نفرت کرتے ہیں۔ بلکہ مولانا کو صرف اعلائے اسلام منظور تھا۔ چنانچہ آپ رئیس الاحرار ہونے کے باوجود پرلے درجے کے عافیت پسند اور حکومت پرست حضرات سے ہم آغوش ہو گئے۔ اور نہایت محبت سے فرمایا کہ میرے بھائی وہ نہیں جو راوی کے کنارے مسلمانان ہند کا جنازہ تیار کر رہے ہیں بلکہ میرے میرے بھائی تم ہو اور میں تمہاری خدمت کو اصل ایمان سمجھتا ہوں۔

گاندھی اور لارڈ اروِن میں صلح کی کوشش

مولانا نے سول نافرمانی کی تازہ تحریک میں بھی بے انتہا کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح گاندھی اور لارڈ اروِن کے درمیان کوئی تصفیہ ہو جائے۔ لیکن ہندو رہنماؤں نے مسلمانوں سے بالکل بے نیاز ہو کر "ہندو راج" قائم کرنے کا جو تہیہ کر رکھا تھا وہ مولانا کے رستے میں بڑی طرح مزاحم ہوا۔ اور آپ اپنے نیک مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔"

گول میز کانفرنس

میں شرکت کی وجوہ

۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مولانا نے جو طویل بیان ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندہ کو دیا تھا اس میں کانگریس کو دو مشورے دیئے تھے ایک تو یہ تھا کہ کانگریس گول میز کانفرنس سے فائدہ اٹھائے اور اس میں شریک ہو اور دوسرا مشورہ یہ تھا کہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے باب میں چار عناصر کا لحاظ رکھنا ہوگا ان چار عناصر میں والیان ریاست (۲) یورپین اور اینگلو انڈین (۳) پست اقوام (۴) مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو شمار کرایا تھا اور کہا تھا کہ اگر لاہور کانگریس نے ان چاروں عناصر کو ہم آہنگ بنا کر گول میز کانفرنس میں شرکت نہ کی تو ہمارے ہاتھ سے ایک ایسا موقع نکل جائے گا جو ہر روز نہیں ملا کرتا مولانا کے ان خیالات سے بھی بے خطا طریق پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے مطمح نظر کے پجاری نہ تھے بلکہ اعلیٰ سیاسیات کے مشیر اور دوربین مدبر تھے۔

جن لوگوں نے مولانا مرحوم و مغفور کے طریقۂ کار کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی نہ وہ کبھی کسی معاملہ پر مزید

گفتگو کا دروازہ بند نہیں کر دیا کرتے تھے اور ہمیشہ حالات سے پورا فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتے تھے ۔ چنانچہ گول میز کانفرنس میں مولانا نے جو تقریر ارشاد فرمائی اس میں ایک طرف اپنے مطمح نظر کی نسبت کہدیا کہ میں درجہ مستعمرات کا قائل نہیں ہوں بلکہ میں آزادی کامل کا حامی ہوں کہ یہاں سے صرف آزادی لیکر جاؤں' اسی باب میں انہوں نے جو خط پارلیمنٹری پارٹی آف انڈین انڈی پنڈنس لیگ کے سکرٹری کو بھیجا تھا اس میں بھی یہی تحریر فرمایا تھا کہ میں درجہ مستعمرات کا قائل نہیں ہوں بلکہ آزادی کامل کا عہد کر چکا ہوں لیکن اگر برطانیہ آج اور ابھی صرف آزادی بھی نہیں دیدے تو میں اس کو سونگھوں گا چکھونگا ۔ اور رکھا کر دیکھونگا کہ وہ ہمارے مطلب کی چیز ہے یا نہیں ۔ اس سے بھی پورا ثبوت اس امر کا ملتا ہے کہ مولانا عملی سیاسیات کی حدود کے اندر ہی رہ کر اپنے مطمح نظر کو حاصل کرنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے اور گفتگو اور مصالحت کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا کرتے تھے ۔

لاہور کانگریس کے بعد سے بعض کوتاہ اندیش لوگ مولانائے مرحوم سے بدگمان ہو گئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی نظر مولانا کی سیرت کے اس پہلو پر شاید کبھی نہیں گئی تھی کہ مولانا باوجود اپنے مطمح نظر کے عملی سیاسیات سے وابستہ رہنا چاہتے تھے اور اسی کے ساتھ برسوں آگے تک کی باتوں پر نظر رکھتے تھے ۔

لوزی صاحب نے مولانا سے ایک پرائیویٹ صحبت میں پوچھا کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ گول میز کانفرنس آپ کے مطمح نظر کو پورا کر دے گی ؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا تھا کہ میں اس شخص کو عقلمند نہیں سمجھتا جو اس اصول پر عامل ہو کہ جو کچھ اُسے آسانی سے مل رہا ہو اس کے لینے سے انکار کر دے اور صرف اپنے مطمح نظر کو پیش رکھے ۔ میرا مطمح نظر آزادی کامل ہے لیکن اگر مجھے کوئی ایسی چیز حاصل ہوتی ہو جو کم از کم آزادی کامل کے حصول میں مدد دے سکتی ہو تو میں ایک ہاتھ سے اس کو لیکر جیب میں رکھ لونگا اور دوسرا

ہاتھ میز پر مار کر مطالبہ کرونگا کہ میرا سوال پورا نہیں ہوا ایک اور سوال کے جواب میں مولانا فرمایا تھا کہ میں تین وجوہ سے گول میز کانفرنس میں شریک ہونیکا قصد رکھتا ہوں (۱) اول تو اس وجہ سے کہ مجھے امید ہے کہ گول میز کانفرنس سے ہندوستان کو ایسی اصلاحات ملینگی جن سے ہندوستان بیس سال کے اندر آزادی کامل حاصل کرنے کی طاقت حاصل کر لیگا اگر اس قسم کی اصلاحات حاصل ہوگئیں تو میں سمجھونگا کہ گول میز کانفرنس کامیاب ہوئی دوسری وجہ یہ ہے کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد تک یا اس کے اندر فرقہ وار مفاہمت کی کوشش کرونگا اور چاہونگا کہ مسلمانوں کے جائز اور معقول مطالبات آئینی طور پر تسلیم کر لئے جائیں اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو آزادی کامل کی منزل تک پہنچنے کے لئے سب سے پہلا شخص میں ہونگا جو مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے آپ کو جنگ آزادی میں جو اس سال کے اندر ہونے والی ہے۔ آگے بیجاؤنگا اور مجھے یقین ہے کہ اگر فرقہ وار مسئلہ قابل اطمینان طریق پر طے ہوگیا تو مسلمانوں کے دل کا کانٹا نکل جائیگا اور وہ حقیقی آزادی کی جنگ میں سب سے آگے ہونگے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ میں ہندوستان اور اپنی قوم کے مسئلہ کو ایک دفعہ اور پلیٹ فارم پر زیر بحث آتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ لندن میں ہندوستان کی گول میز کانفرنس ایک ورلڈ پلیٹ فارم ثابت ہوگی۔

مولانا نے جس امر دوم کی جانب اشارہ کیا تھا اس کی تمہید اگرچہ جہاز پر ہی شروع کردی گئی تھی لیکن افسوس کہ ہندوؤں نے مولانا کی مخلصانہ اپیلوں پر کان نہ دھرا۔ تاہم مولانا نے اپنی تقریر میں اپنے ارادہ کو پوری طرح ظاہر کرکے بتادیا کہ برادران وطن چاہے جو بھی نسبت رکھتے ہوں مگر وہ تنہا ہرگز کسی قلیل سے قلیل چیز کے حصول پر بھی قادر نہیں ہیں اور جو کچھ ان کو مل سکتا ہے وہ متحدہ طاقت ہی سے مل سکتا ہے بہر حال چونکہ اپنی نوعیت میں مولانا کی یہ تقریر اپنے نصب العین کو پورے طور پر واضح کردینے والی ہونے کے ساتھ باعتبار سیاست اور باعتبار شخصیت بھی آخری ہے اس لئے ہم

اسے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

شیر اسلام کی آخری گرج

گول میز کانفرنس میں رئیس الاحرار کی ہنگامہ خیز تقریر

مولانا محمد علی نے بعذر علالت صدر سے بیٹھے بیٹھے تقریر کرنے کی اجازت حاصل کی اور فرمایا:-

میرے دوست مونجے نے اپنی سرگذشت بیان کر دی ہے، اور بتا دیا ہے کس طرح انہیں وطن کا غدار کہا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب ہم ہندوستان سے روانہ ہونیوالے تھے تو تجویز یہ ہوئی تھی کہ سیاہ ماتمی جھنڈیوں کے ساتھ ہمیں "خیرباد" کہی جائے اور جن لوگوں کے ساتھ ہم نے مدت العمر کام کیا تھا ان کے جذبات تھے کہ جہاز "وائسرائے آف انڈیا" سمندر کی لہروں سے عہدہ برآنہ ہو سکے۔ جب میں اس ملک میں پہونچا تو یہاں کے اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" نے (جس کے مالی استحکام میں میں نے بھی حصہ لیا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ آج اس کی اشاعت دس لاکھ تک پہنچی ہے) میری تصویر شائع کی اور میری نسبت لکھا کہ میں نے اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا ہے یعنی میں حب وطن کو چھوڑ کر غدار وطن بن گیا ہوں۔

جب قدامت پسند لارڈ نے کل صفائی اور نیک نیتی کے ساتھ سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی پارلیمنٹ میں

ماہمانیم کہ بودیم

ایک بڑے ہی قدامت پسند بزرگ موجود ہیں یعنی سر جارج اومن جو آکسفورڈ میں میرے استاذ اور اتالیق تھے، میں ان کی تاریخ سے یہاں ایک مختصر سا فقرہ پیش کرتا ہوں جو ان سوالات میں سے ایک تھا جو انڈین سول سروس کے امتحان میں ہم سے کئے گئے میں بھی اس امتحان میں شریک ہوا تھا یہ نا کامیاب تھا سر جارج لکھتے ہیں کہ "عرب ہی دنیا میں ایک ایسی قوم ہے جس کے عقیدہ کو تبدیل کرنا غیر ممکن ہے۔" میں یہاں کے سفید فام افراد اور ڈاکٹر مونجے کی طرح یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ میری رگوں میں آریائی خون دوڑ رہا ہے میری رگوں میں وہی خون ہے جس سے شاید لارڈ ریڈنگ کی رگیں معمور ہیں، جنہوں نے مجھے قید کیا تھا۔ میں سامی نسل سے تعلق رکھتا ہوں، اور اگر لارڈ ریڈنگ نے صیہونیت سے برگشتگی اختیار نہیں کی۔ (قہقہہ) تو میں نے بھی اسلام کو ترک نہیں کیا۔ میں جہاں پہلے تھا وہیں اس وقت تک ہوں، اپنی جماعت کا میں ہی ایک فرد ہوں، جسے ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے یا ملک معظم کی حکومت نے یا کسی دوسری ہئیت حاکمہ نے جس کی ہدایات کے ماتحت ان عجیب و غریب مندوبین کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ منتخب کر کے یہاں بھیجا ہے، ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم کس کے مندوب ہیں (قہقہہ) میں کسی جماعت کی نمائندگی کا دعویدار نہیں لیکن میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے، کہ جب آپ صبر و سکون کے ساتھ میری ساری باتیں سن لیں گے، تو میرے دعوے کو حق بجانب قرار دیں گے کہ میں اپنی ذات کے متعلق کوئی غلط بیانی نہیں کرونگا میں سمجھتا ہوں کہ اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ سیاسیات میں لوگ اپنی ذات کے متعلق غلط بیانیاں کرتے ہوئے اکثر و بیشتر متامل نہیں ہوتے۔

چھوٹے دل اور بڑی سلطنتیں

لارڈ پیل نے کل جو کچھ کہا تھا اس کے جواب میں میں صرف ایک انگریز شاعر کے حوالے پر اکتفا کرونگا جیسا کہ میں نے برآمدے میں سے آتے ہوئے کہا تھا میں

کہا تھا، کہ جناب والا! آپ قدامت پسند ہیں، اور قدامت پسند رہیں گے ڈینی سن نے قدامت پسندی کی تعریف یہ کی ہے کہ بہترین قدامت پسند وہ ہے، جو خشک شاخ کو کاٹ ڈالتا ہے لارڈ پیل نے خلوص و صاف گوئی کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا، وہ سوکھی ہوئی شاخ کے مانند ہیں جسے کاٹ ڈالنا چاہیئے (قہقہہ) میری طرف سے لارڈ پیل کی تقریر کا یہی کافی جواب ہے باقی رہا دوسرا قدامت پسند یعنی ہمارے والی ریاست ہز ہائینس مہاراجہ صاحب ریوا تو میں نہیں سمجھتا کہ انہیں واقعی قدامت پسند ماننا چاہیئے یا نہیں (قہقہہ) اگر وہ برک کو قدامت پسند سمجھتے ہیں، اور اپنی تقریر کے آخر میں اس کی تقریر کا حوالہ دینا پسند کرتے ہیں تو میں کہونگا کہ قدامت پسند رہیے اور قدامت پسندی کا دامن نہ چھوڑیے ہز ہائینس نے برک کے حوالہ سے کہا تھا کہ "کمر چھوٹے دلوں اور بڑی سلطنتوں کا کوئی ساتھ نہیں" اگر سلطنت برطانیہ دا سے سلطنت یا مختلف اقوام کی دولت متحدہ یا جو کچھ آپ کے جی میں آئے کہیے) بڑا رہنا چاہتی ہے، تو چھوٹے دلوں کو جو مدت مدید سے نظر آرہے ہیں، اور جن کی آواز برابر سنائی دے رہی ہے لازماً غائب ہو جانا چاہیئے (تالیاں) اگر آپ برک کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے تو امریکہ آپ سے نہ چھنتا، آج آپ کو جنگی جہازوں کی تعمیر کا شور سنائی نہ دیتا، قرضے ادا نہ کرنے پڑتے، یہ پریشانیاں لاحق نہ ہوتیں تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کے لئے راستہ صاف کرنے کی غرض سے آپ کو بار بار جنیوا جانا نہ پڑتا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ تیاریاں کب تک جاری رہیں گی، (قہقہہ) یہ ساری مصیبتیں آپ کو اس لئے پیش آئیں کہ آپ نے اپنے سب سے بڑے سیاست دان اور سب سے بڑے مدبر کے قول کو پس پشت ڈال دیا، یہ وہی شخص تھا جسے دار العوام میں ڈنر دیکھنے کی گھنٹی کہا جاتا تھا، کیونکہ جب برک تقریر کے لئے اٹھتا تھا، تو آپ سب لوگ کھانا کھانے کمرہ سے باہر چلے جاتے تھے، برک جیسے آدمیوں کے معاملہ میں آج بھی آپ کا

سلوک ویسا ہی ہے اور اسی لئے میں دوبارہ برک کے الفاظ کا حوالہ دیتا ہوا کہتا ہوں کہ "تجاویز کی ضرورت نہیں آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

میں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ آپ ہمارے لئے کونسا دستور اساسی تیار کرتے ہیں لیکن کاش آپ کے پاس انگلستان میں ایک آدمی بھی ہو جو درحقیقت انسان ہو اور جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے:۔

"اے خدا ایسا انسان دے جو دل و دماغ اور ہاتھ رکھتا ہو وہ ان بعض بڑے آدمیوں کی طرح جو ہمیشہ کے لئے گذر چکے ہیں ایک شور و غوغا سے لبریز سرزمین میں ایک طاقتور آدمی کی ضرورت ہے وہ خواہ امیر ہو خود مختار ہو جمہوریت پسند ہو کچھ بھی ہو مگر ایسا ہونا چاہئے جو حکومت کر سکے اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرے"۔

مجھے امید ہے کہ میرے قدیم دوست مسٹر میکڈانلڈ کم سے کم اس حکمراں آدمی کو ثابت کر دکھائیں گے اور وہ اپنی جماعت اپنے ضمیر اپنی مردہ بیوی کی روح اور اپنے زندہ ملک سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کرینگے اور اگر آپ لوگ جن کا تعلق تمام پارٹیوں سے ہے اس کی مدد کریں گے جو آپ کو کرنی چاہیئے تو مجھے یقین ہے کہ آپ تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرینگے۔

ملک معظم بھی انسان ہیں

میں ایک ریپبلیکن (جمہوریت پسند) ہونیکے باوجود اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ جس قدر میں اپنے پرانے دوست مسٹر میکڈانلڈ پر بھروسہ کرتا ہوں اس سے زیادہ مجھے اُس آدمی پر بھروسہ ہے (میں اسے انسان ہی کہونگا کیونکہ آخر وہ انسان ہے) جس نے دارالامرا کی گیلری میں اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اور جس کا نام جارج پنجم ہے خواہ آپ اسے شہنشاہ کہیں یا جو کچھ بھی کہیں وہ ایک انسان ہے دفعہ ہا مسٹر [illegible] اپنے گذشتہ

یا موجودہ وزراء میں سے کسی کو لیجئے لیکن وہ انسان اس کے مقابلہ میں ہندوستان کو بہتر جانتا ہے (نعرہ ہائے تحسین) میری نگاہیں اب اس انسان کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ وہ خدا کی تین کروڑ مخلوق کے ساتھ انصاف کرے جو دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ ہندوستان کے والیان ریاست کی حیرت انگیز حب وطن کو دیکھ کر جو یہاں ایک قطار میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں اور جو ہندوستان کا قدامت پسند عنصر ہیں میرا ایمان زیادہ مستحکم ہو گیا ہے (نعرہ ہائے تحسین) لارڈ پیل اور لارڈ ریڈنگ کے لئے یہ نئی بات ہو گی مگر میرے لئے نئی بات نہیں ہے۔

ریاستوں سے تعلقات

میری شخصیت اس جگہ ایک عدیم النظیر حیثیت رکھتی ہے میں برطانی رعایا ہوں گو مجھے انڈین سول سروس کے امتحان سے پہلے اس بنا پر خارج کر دیا گیا تھا کہ میں برطانی پیدائشی رعایا نہیں ہوں لیکن مجھے عارضی طور پر امتحان میں داخل کر لیا گیا۔ تا آنکہ یہاں کے حکام کو میری والدہ کی طرف سے شہادت مل گئی لیکن اسی کے ساتھ میں ایک ہندوستانی ریاست کی رعایا ہوں اور اس لحاظ سے جیسا میں بیان کر چکا ہوں اس کانفرنس میں ایک بے مثل شخص ہوں۔ میں ایک ریاست میں پیدا ہوا اسی ریاست میں ملازمت کے فرائض انجام دیئے۔ میں ریاست بڑودہ میں بھی ملازم رہا ہوں میرے آقا گائیکواڑ بڑودہ اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے سات سال تک ان کا نمک کھایا۔ دو سال ہوئے میں اس قدر سخت بیمار ہو گیا کہ بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی تو اس وقت ہز ہائنس مہاراجہ الور نے اپنا خاص ڈاکٹر اپنے خرچ پر میرے علاج کے لئے بھیجا۔ جب پچھلے ہفتہ میں میری حالت نازک ہو گئی تو ہندوستان کے ایک والئی ریاست نے جن کو میں ایک مرتبہ پرائیویٹ ٹیوٹر کی حیثیت سے پڑھانے والا تھا ایسی مہربانی کا ثبوت دیا جس کا حق ابھی اہل برطانیہ ادا نہیں کر سکے ہیں ہز ہائنس نواب صاحب

بھوپال نے اپنے مہمان خانہ کو میری خاطر شفا خانہ میں منتقل کر دیا۔ اگر انگریز بھی ہر میں جو سلطنت برطانیہ میں موجود ہے مجھے ایک آزاد مریض تسلیم کریں تو میں سمجھونگا کہ انہوں نے مہمان نوازی کا پورا حق ادا کر دیا۔ (قہقہہ)

سراپا امراض

جب مجھے شملہ کے شفا خانہ میں بھیجا گیا تو میں ایک طرف ایک یورپین خاتون اور دوسری طرف ایک فوجی افسر کے درمیان حائل ہو گیا جن کی شادی عنقریب ہونے والی تھی۔ میرا کمرہ ان دونوں کے کمروں کے درمیان تھا۔ دونوں بیمار تھے۔ خاتون نے جب ایک عجیب ہیئت کے ہندوستانی کو یورپین کوارٹر میں آتے دیکھا تو اس نے ہمارے ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ بڑے میاں کو کس مرض کی شکایت ہے؟ ڈاکٹر نے جواب دیا یہ نہ پوچھو کہ اسکو کیا شکایت ہے۔ بلکہ یہ پوچھو کہ اسے کونسے مرض کی شکایت نہیں ہے (قہقہہ) میری یہ کیفیت ہے کہ قلب کی حالت درست نہیں بینائی میں فرق آگیا ہے۔ پاؤں متورم ہیں۔ ذیابطیس کا عارضہ ہے۔ بیماریوں کی اس طویل فہرست سے جو آپ کے سامنے میں نے پیش کی ہے۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کہیں کرنل گڈنی ایک طبیب کی حیثیت سے تشریح امراض کے معاملہ میں مجھے اپنا رقیب نہ سمجھ لیں (قہقہہ) میں کہتا ہوں کہ جب آدمی کے حواس بجا ہیں وہ ان بیماریوں کے ساتھ سات میل کا سفر بھی طے نہ کر سکتا لیکن پھر بھی میں خشکی اور سمندر کے سات ہزار میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ کیونکہ جہاں اسلام اور ہندوستان کا معاملہ آجاتا ہے وہاں میری حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے" ڈیلی ہیرلڈ" نے لکھا ہے کہ میں نے اپنا سیاسی عقیدہ تبدیل کر لیا ہے۔ میں پہلے گورنمنٹ کا باغی تھا لیکن اب اپنے ملک کا غدار ہوں اور اب میں گورنمنٹ کیساتھ ملکر کام کر رہا ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ میں شیطان کے ساتھ بھی ملکر کام کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ خدا کے راستے میں کام کرنا ہو۔

آزادی یا موت

مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے اس طویل تمہید کے لئے جس میں میں نے اپنی بیماری اور عوارض اور دیگر باتوں کا ذکر کیا ہے معاف فرمائیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج جس ایک مقصد کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو صرف اسی حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤنگا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ملک ہی ہو مرنے کو ترجیح دونگا اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دینگے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔ (نعرہ ہائے تحسین)

قدامت پسندوں کا تذکرہ

میں پہلے کنسرویٹو اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جب میں اس ڈنر میں شریک ہوا جو گورنمنٹ کی مہمان نوازی کے صدقہ میں ہمارے لئے مہیا کیا گیا تھا جبکہ میں درحقیقت بہت بیمار تھا اور مجھے بستر پر پڑا رہنا چاہیئے تھا تو میں اس انتظار میں تھا کہ مجھے چیری کی لکڑی کا پائپ نظر آئے (جسے ہر وقت مسٹر بالڈون پیتے رہتے ہیں) اور خدا کا شکر ہے کہ وہ پائپ نظر آگیا۔ میں مسٹر بالڈون کے پاس گیا اور ان سے کہا آپ نے دو طریقوں سے تاریخ کو روشن کیا ہے۔ اگرچہ آپ اور آپ کے کنسرویٹو ہیں اور آپکا تعلق ایک ایسی پارٹی سے ہے جو نام نہاد واحد امراء کی ہے آپ نے کم سے کم قاعدہ قائم کرکے ایک انسانی فرض ادا کیا ہے کہ تمہاں ڈنر کے بعد [illegible] کرونا (اعلیٰ) [illegible]

پیا جا سکتا تھا وہاں ایک بھلا آدمی اپنے چیری کے پائپ میں ادنیٰ قسم کا تمباکو بھی استعمال کر سکتا ہے جیسا کہ میں اکسفورڈ میں کیا کرتا تھا آپ نے ایک اور کام بھی کیا ہے۔ جو تاریخی پہلو سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے ہندوستان میں لارڈ ارون کی وضع کا ایک کنسرویٹو وائسرائے بھیجا (نعرہ تحسین) اگر کسی شخص نے آج سلطنت برطانیہ کو تباہی سے بچایا ہے تو وہ یہی لمبا تڑنگا دبلا پتلا سا علیسائی ہے (نعرہ تحسین)

اگر آج لارڈ ارون ہندوستان میں نہ ہوتے تو خدا جانے اس ملک میں کیا ظہور میں آتا۔ کم سے کم میں اپنا سیاسی عقیدہ تبدیل نہ کرتا" جیسا کہ میری نسبت سمجھا جاتا ہے ہم اسوقت اس گول میز کے گرد بیٹھے دکھائی نہ دیتے۔ ہم یہاں صلح و دوستی اور آزادی کیخاطر آئے ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ ہم یہ تمام چیزیں لیکر واپس جائیں گے۔ اگر ہمیں یہ چیزیں نہ ملیں تو ہم ملک کی لڑائی لڑنے والوں کی صفوں میں واپس چلے جائیں گے جہاں ہم دس سال پہلے موجود تھے۔ وہ آج ہمیں ملک کا غدار کہتے ہیں۔ اُس وقت آپ ہمیں باغی کہہ دیجئے گا۔

حکومت ہند کی مراسلت

میں نے ہزایکسیلنسی لارڈ ارون کے بارے میں کچھ کہا ہے۔ لیکن میں ان باتوں کو ان کی گورنمنٹ سے منسوب کرنا نہیں چاہتا۔ ہندوستان کے ارباب حل وعقد نے الماناک طور پر معاملات کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ حکومت ہند کی مراسلت کا ہر چند یہی ایک اچھا پہلو ہے کہ اس نے ہمارے لئے ایک اور تاریخی دستاویز تیار کی ہے کیونکہ ہمیں صرف سائمن کمیشن کی رپورٹ ہی پر غور نہیں کرنا ہے (یہ مراسلت ایک نہایت یاس انگیز تحریر ہے۔ اس تحریر کے بعد سب سے اچھا کام ہم یہی کر سکتے

ہیں کہ ہم یہاں اپنی ایک تاریخی دستاویز مرتب کریں۔ دونوں عظیم الشان ملکوں کے بہترین دل و دماغ یہاں موجود ہیں۔ گو بہت سے لوگ جنہیں آج یہاں ہونا چاہیے تھا ابھی تک ہندوستان کے جیل خانوں میں بند ہیں۔ مسٹر جیکر۔ سر تیج بہادر سپرو اور ہیں مسٹر وائسرائے اور گاندھی جی کے درمیان صلح کرانے کی انتہائی کوشش کی لیکن ہم ناکام رہے۔ سب سے پہلے اس مہم میں میں نے قدم اٹھایا۔ لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ مجھے اُمید ہے کہ اس مرتبہ جب ہم اپنے ملک کو واپس جائیں گے تو ہم آزادی کی سند ساتھ لیجانے میں ناکام نہیں رہیں گے۔

میں ہندوستانیوں سے بھی لڑ سکتا ہوں

لارڈ پیل نے کہا ہے" ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لیکن جب آپ اپنے ملک کو لیا دستور اساسی لیکر واپس جائیں گے۔ جیسا آپ چاہتے ہیں تو وہ لوگ جو آپ سے تعاون نہیں کر رہے ہیں دستور کو آپ کے ہاتھ سے چھین نہیں لیں گے؟ یاد رکھیے کہ جب میں انگریزوں سے لڑ سکتا ہوں تو میں ہندوستانیوں سے بھی لڑ سکتا ہوں لیکن پہلے مجھے کوئی ایسی چیز تو دیجئے جسکی خاطر میں لڑ سکوں یہ نہو کہ میں یہاں سے غلامی کی سند لیکر جاؤں اور پھر آپ مجھ سے یہ توقع رکھیں کہ میں اپنے ہی لوگوں سے لڑوں (نعرہ تحسین) میں یہ نہیں کر سکتا اور اگر کروں بھی تو ناکام رہونگا۔ لیکن آزادی کی سند ہاتھ میں لیکر میں خوشی خوشی ان لوگوں کے پاس جاؤنگا جن کے نام سے میرے دوست مسٹر جیکر نے تقریر کی ہے۔ انہوں نے نوجوان ہندوستان کیطرف سے بولنے کا دعویٰ کیا تھا۔ میرے خیال میں مسٹر جیکر کو اس بات کا علم ہے کہ گو میں عمر میں ان سے بڑا ہوں لیکن مزاج اور طبیعت اور لڑنے کی خواہش کے اعتبار سے میں ابھی ایک نوجوان آدمی ہوں میں اسوقت عدم تعاون کے اصول پر

عمل پیرا تھا جبکہ مسٹر جیکر قانونی عدالتوں میں وکالت کرتے تھے (مسٹر جیکر نے اپنا سر ہلایا) بہرحال وہ میرے ساتھ جیل میں نہ تھے۔ میں اور میرا بھائی پہلے اشخاص تھے جنہیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں بھیجا۔ مجھے اس معاملہ میں ان سے کوئی شکایت نہیں ہے (چیرز) لیکن میں بھی وہی اختیار چاہتا ہوں کہ جب لارڈ ریڈنگ ہندوستان میں کسی جرم کے مرتکب ہوں تو میں بھی انہیں جیل بھیج سکوں۔

میں کامل آزادی چاہتا ہوں

میں آپ سے ڈومنین سٹیٹس (درجہ مستعمرات) لینے کے لئے نہیں آیا ہوں میں ڈومنین سٹیٹس کا قائل نہیں ہوں میں "کامل آزادی" کے عقیدہ کا پابند ہوں۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں ہم نے مدراس میں ایک قرارداد پاس کی تھی اور کامل آزادی کو اپنی منزل مقصود قرار دیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۸ء کی آل پارٹیز کنونشن میں نہرو رپورٹ کے پاس کرنے کی تحریک پیش کی گئی تھی۔ اس دستور کی پہلی دفعہ ڈومنین سٹیٹس کے متعلق تھی۔ میرے پرانے سکرٹری پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی جو آج کانگریس کے پریذیڈنٹ ہیں ان کے باوا نے دبا دیا تھا۔ فارسی کی ایک ضرب المثل ہے "سگ باش برادر خورد مباش" اور جب آپ دیکھتے ہیں کہ میرا بڑا بھائی وہاں بیٹھا ہے جو بقول کرنل ودجوڈ سات فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا ہے (قہقہہ) تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ میں اس فارسی ضرب المثل کا کیسا قائل ہوں۔ جواہر لال کے معاملہ میں یہ کہونگا کہ "بلی بن جاؤ لیکن اپنے باپ کے بیٹے نہ بنو"۔ کیونکہ یہ باپ ہی تھا جس نے کانگریس کے پریذیڈنٹ کی حیثیت سے سنہ ۱۹۲۸ء کی کانگریس میں غریب جواہر لال کا گلا گھونٹا تھا۔ خیر اس وقت جبکہ وہ کامل آزادی کے لئے آواز بلند کرنے سے معذور تھے۔ ان کی بجائے میں اٹھا اور میں نے درجہ مستعمرات والی دفعہ کی مخالفت کی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۹ء میں جواہر لال کی طرح میں نے

آگے قدم نہ بڑھایا۔ اور اسے اپنا سیاسی عقیدہ نہ بتایا۔ کیونکہ کانگریس میں ایک مرتبہ ہم سیاسی مسلک قائم کر لیتے ہیں۔ تو ہم کسی شخص کو جو یہ مسلک نہ رکھے۔ کانگریس میں داخل نہیں کر سکتے۔ میں نے گفت و شنید کے لئے بحث کا دروازہ کھلا رکھنا پسند کیا میں کسی شخص پر ایسا دروازہ بند کرنا نہیں چاہتا۔ ہز ایکسیلنسی لارڈ اِرون جو ایک کنسرویٹو وائسرائے ہیں "موقع کے آدمی" تھے۔ اور جو کچھ انہوں نے موقعہ پر دیکھا اس کا ان پر کافی اثر پڑا۔ اور وہ یہاں آئے۔ جب ہم لندن میں آتے ہیں۔ تو ہم یہ سنتے ہیں کہ ہر شخص "عام آدمی" سے اپیل کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ "عام آدمی" کون ہے۔ لیکن لارڈ ر اور سر لارڈ بروک اور دوسرے اشخاص بھی "عام آدمی" کی نسبت ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ وہ مرافعہ کی آخری عدالت ہے۔ ہندوستان میں ہمیں ہمیشہ "موقع کے آدمی" (MAN-ON-THE-SPOT) سے واسطہ پڑتا ہے۔ غرض "موقع کا آدمی" یہاں آیا۔ اور اس نے عام آدمی (MAN IN-THE STREET) سے جو ایک سربرآوردہ شخص ہے اور اس وقت صدر نشین ہے۔ (وزیر اعظم) گفتگو کی۔ مجھے یقین ہے کہ اول الذکر نے ان لوگوں کو نصیحت کی۔ جو اپنے سیاسی عقائد تبدیل کر چکے تھے انہوں نے مسٹر بالڈون کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ انہوں نے کچھ کنسرویٹو اصحاب کو ساتھ ملا لیا۔ انہوں نے ہر شخص کو اپنے امکان بھر اپنا ہمنوا بنا لیا (اور یہ اعلان کیا کہ جب انگریزوں نے ۱۹۱۷ء میں "ذمہ دار حکومت" کا اعلان کیا تھا تو اس وقت ان کی مراد "ڈومنین سٹیٹس" تھی اس سے وہ پردہ اٹھ گیا جو ۱۹۲۴ء کی انڈین لیجس لیٹو اسمبلی کے ایک قابل یادگار جلسہ میں اس وقت ہوم ڈیپارٹمنٹ کے افسر الخارج نے اس معاملہ پر ڈالا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ صاحب یہاں آج موجود ہیں۔

ایک کھوئی ہوئی ڈومینین

دو یا تین دن ہوئے میں نے یہ کہا تھا کہ ہندوستان کی رفتار بے حد تیز ہو چکی ہے۔ ہم منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے جبری کوچ کر رہے ہیں جس سے دنیا حیران رہ جائے گی۔ ہم اُس وقت تک ہندوستان واپس نہیں جائینگے تاوقتیکہ برطانیہ میں ایک نئی ڈومینین پیدا نہو جائے۔ ہم اگر اس نئی ڈومینین کی پیدائش کے بغیر ہندوستان واپس چلے گئے۔ تو میرا خیال ہے کہ ہم ایک جنی کھوئی ہوئی ڈومینین (سلطنت) میں جائیں گے۔ ہم ایک نئے امریکہ کو واپس جائیں گے۔ اسوقت آپ دیکھیں گے کہ برطانیہ کی دولت متحدہ یا سلطنت برطانیہ کے اندر نہیں بلکہ اس کے بالکل باہر ایک اتحاد ریاست ہائے ہند کا ایک آزاد نظام ہوگا جسمیں والیان ہند ڈاکٹر مونجے، مسٹر جیکر، میرا بڑا بھائی اور میں موجود ہونگے۔ بلکہ وہ نظام ریاستہائے متحدہ امریکہ سے بھی بہتر ہوگا۔ میں نے اکسفورڈ چھوڑنے سے تھوڑے عرصے بعد یہ لکھا تھا کہ ہمیں ہندوستان میں جو کچھ ملیگا وہ ایک امریکہ سے بہتر ہوگا کیونکہ امریکہ میں تو صرف "ریاستہائے متحدہ" ہی ہیں بلکہ ہندوستان میں ریاستوں کے علاوہ "مذاہب متحدہ" بھی ہونگے۔

ملکہ وکٹوریا کا پوتا

یہ ہیں وہ جذبات جو ہمارے دلوں میں موجزن ہیں اور جن کیساتھ ہم یہاں آئے ہیں۔ اب انکا انحصار ہمارے کنسرویٹو دوستوں ہمارے ریڈیکل دوستوں ہمارے لیبر والے دوستوں اور ان سے بھی زیادہ ایک شخص پر ہے جس پر دوسرے تمام اگریزوں کی نسبت زیادہ اعتماد رکھتا ہوں، میرا اشارہ ہز مجسٹی شاہ جارج

کیطرف ہے۔ جونیک دل وکٹوریا کے پوتے ہیں جنکی اُس محبت سے جو اُنجہانی کو ہندوستان سے تھی کوئی شخص انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس کی تمام زندگی ہندوستان کا میگنا چارٹا (آزادی کی شاہی سند) تھی اور اس کے پوتے کے زمانہ میں تاریخ کے الفاظ اس طرح لکھے جائیں گے "جارج سوم نے امریکہ کو کھو دیا۔ اور جارج پنجم نے ہندوستان جیت لیا" (نعرہ تحسین)

تم نے ہندوستان کو نامرد بنا دیا

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس معاملہ میں بہت سی مشکلات ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ "ریاستوں کیطرف دیکھو"۔ میں ریاستوں ہی سے آرہا ہوں اور یقین سے کہتا ہوں کہ وہ ہمارے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتیں (چیرز) پھر "فوج کا سوال ہے"۔ فرمائیے اس کی بابت آپ کیا کہیں گے؟ برطانیہ کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ آج ہندوستان کی فوج اپنی نہیں ہے۔ اور اگر آپ خود ہی فوج کا عذر پیش کرینگے تو اپنے ہی منہ سے اپنے آپکو قابل ملامت قرار دینگے میں آپکو صفائی اور ایمانداری سے لیکن دوستانہ طور پر کہے دیتا ہوں کہ آپ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آپ نے ہندوستان کو مردانہ اوصاف سے محروم کردیا (اظہار مسرت)

بتیس کروڑ انسان ہلاک نہیں کئے جائینگے

مجھے یہ سنکر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوست ڈاکٹر مونجے بھی میرے اس قول پر اظہار مسرت کر رہے ہیں۔ مجھے ان سے یہ سنکر بہت رنج ہوا تھا کہ جب ہمارے آدمیوں پر گولیاں چلائی گئیں تو وہ بھاگ گئے۔ اور پھر واپس آگئے۔ ہمارے پاس بتیس کروڑ آدمی ہیں۔ جب وہ قحط اور پلیگ سے لاکھوں کی تعداد میں

(کتے کی موت) مرنا جانتے ہیں تو وہ یقیناً برطانی گولی سے جان دینے کی بھی توفیق رکھتے ہیں۔ یہی سبق ہے جو گاندہی جی نے ہمیں سکھانا چاہا۔ اور یہی سبق ہے جو ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ جب گاندہی جی نے جنوبی افریقہ کی مہم کا علم بلند کر رکھا تھا تو اسوقت یعنی ۱۹۱۳ء میں میں انگلستان میں تھا۔ ایکس ہال میں مسٹر جی کے جسٹرٹن کی زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اور اس میں مجھے تقریر کرنے کے لیئے کہا گیا۔ دوسرے مقررین نے گاندہی جی کے نئے فلسفہ کا اپنی تقریروں میں ذکر کیا تھا۔ میں نے یہ کہا تھا" براہ کرم اس نئے فلسفہ کے متعلق ایک بات کو سمجھ لیجئے خواہ یہ فلسفہ گاندہی جی کا ہے یا ٹالسٹائی کا۔ یسوع مسیح کا ہے یا میرا۔ لیکن ہے وہی عالمگیر انسانی فلسفہ کہ کوئی شخص لڑائی میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اگر اسکے دل میں محض مار ڈالنے کا ارادہ موجود ہے۔ آپ سب کو دوسرے کی جان لینے کا ارادہ کرنے سے پہلے اپنے دل میں مرنے کی خواہش پیدا کرنی چاہیئے۔ ہندوستان میں مار ڈالنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن جب ہمارے دلمیں مرنے کا شوق پیدا ہوجائیگا تو اسوقت اعداد و شمار اس امر کی شہادت دینگے کہ ۳۲ کروڑ انسانوں کو ہلاک نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جس سے آپ ۳۲ کروڑ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سامان مہیا کرسکیں۔ اگر آپکے پاس کوئی ایسی مشین ہو اور سامان بھی ہو تو پھر آپکے پاس وہ اخلاقی طاقت (یا بداخلاقی) نہیں کہ آپ ۳۲ کروڑ انسانوں کو ہلاک کرنے کی جرات کرسکیں ہم میں ایک آزاد اور متحدہ قوم کی حیثیت سے ہندوستان کی زندگی کے لیئے مرنے کی خواہش ہونی چاہیئے اور یہ خواہش ہم میں بڑی تیزی سے پیدا ہورہی ہے۔ جب یہ خواہش ایک مصمم ارادہ کی صورت اختیار کرلے گی تو پھر آپ کیا کرسکیں گے۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس خیال کو اپنے دلمیں جگہ نہیں دے سکتا کہ آپکو سامنے انگلستان میں ایک سو بھی ایسے شقی القلب

آدمی بل سکیں گے۔ جوان نہتے اور غیر متشدد لوگوں پر فائر کرنے کے لئے تیار ہو جائیں جو اپنے ملک کی آزادی کی خاطر مرنے پر آمادہ ہیں! نہیں! نہیں! میں انگریز سپاہیوں کو ایسا برا نہیں سمجھتا۔

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

اصلی مسئلہ جس نے اس تمام عرصہ میں ہم کو پریشان کر رکھا ہے وہ ہندو مسلم مسئلہ ہے۔ لیکن در حقیقت یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج کے مشکل مسئلہ کی طرح ہندو مسلم مسئلہ بھی آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے (ڈاکٹر مونجے سنو! سنو!!) لیکن معاملہ صرف اسی قدر نہیں ہے: یہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا پرانا اصول ہے۔ لیکن یہاں تقسیم عمل بھی ہے۔ پھوٹ اپنے آپ میں ہم ڈالتے ہیں۔ اور حکومت آپ کرتے ہیں۔ جس وقت ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اپنے آپ میں یہ پھوٹ نہیں پڑنے دینگے آپ ہم پر اس طرح حکومت نہیں کر سکیں گے۔ جس طرح اب کر رہے ہیں۔ یہاں ہم اس مصمم ارادہ کے ساتھ آئے ہیں کہ ہم میں پھوٹ نہیں پڑے گی۔ میں ہر برطانی مرد اور ہر برطانی عورت کو جو ہماری قسمت کو ایک نئے مستقبل کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ یقین دلاتا ہوں کہ آج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف یہ جھگڑا ہے کہ مسلمان ہندو کے تفوق سے ڈرتا ہے اور ہندو مسلمان کے تفوق سے (ڈاکٹر مونجے "نہیں ہندو کبھی نہیں ڈرتا")

خیر مجھے یہ سنکر بہت خوشی ہے۔ ہمارے ملک میں بھینس صرف اسی وقت حملہ کرتی ہے جب وہ ڈر جاتی ہے گائے کے لئے ہندو کے دل میں خواہ کتنا ہی احترام ہو لیکن مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ ہندو بھینس سے کبھی نہیں ڈرتا میں اس ڈر سے نجات پانا چاہتا ہوں۔ یہی ڈر ہے کہ آج ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے ڈر رہے ہیں

ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی برطانی تفوق کے روادار نہیں ہونگے۔

برطانیہ کا اقتدار اور برطانیہ کی دوستی

یہ بات سمجھنے کے قابل ہے۔ ہندوستان پر برطانی تفوق کا تو اب خاتمہ سمجھنا چاہیئے۔ لیکن برطانیہ کے ساتھ ہماری دوستی کا بھی خاتمہ ہو جائیگا؟ میرے بھائی نے سترہ سال تک گورنمنٹ کی خدمت کی۔ لیکن انہوں نے میرے لئے ایک کام کیا۔ انہوں نے مجھے آکسفورڈ بھیجا۔ عدم تعاون کے دنوں میں وہ مجھے ہمیشہ یہ طعنہ دیتے رہے کہ "تمہارے دل کے کونہ میں اس مقام کے لئے جسے آکسفورڈ کہتے ہیں کچھ نہ کچھ محبت ضرور موجود ہے۔ مجھے تسلیم کرنا چاہیئے کہ میرے دل میں آکسفورڈ کی محبت ضرور ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے چار سال وہاں گزارے۔ میں اس زمانہ کے نہایت خوشگوار واقعات کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھتا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ یہ احساس قائم رہے۔ مجھے آکسفورڈ کی درسگاہ سے محبت ہے میں اپنے بھائی کو بھی طعنہ دے سکتا ہوں۔ جب کراچی میں ہم پر مقدمہ دائر کیا گیا تو جیوری نے ہمیں بری کر دیا۔ اس جیوری میں ایک انگریز ممبر بھی تھا۔ لیکن سب ممبروں نے ہماری رہائی کے لئے ووٹ دیئے۔ کیونکہ ہم بڑے مزے کے کھلاڑی تھے۔ اسوقت میرے بڑے بھائی نے کہا تھا" اگر یہ بات مجھ پر فرض قرار دی جائے کہ میں سب سے پہلے انگریز کو جو میرے سامنے ہے موت کے گھاٹ اتار دوں۔ اور اگر اس انگریز کی آنکھیں نیلی ہوں تو میرا چاقو اس پر وار نہیں کریگا۔ کیونکہ اسوقت مجھے اپنے پرانے کالج (علیگڈھ) کے سابق پرنسپل مسٹر تھیوڈر بیک آنجہانی کی آنکھیں یاد آجائیں گی" یہاں علیگڈھ کے کئی اولڈ بوائز موجود ہیں۔ اور وہ اس واقعہ کی تصدیق کر سکتے ہیں ہم لوگ جو علی گڈھ میں بیک کی آغوش تربیت میں پلے ہیں۔ انگریزوں کی محبت کے خیال

کو اپنے دل میں جگہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ہندوستان میں برطانی تفوق کا خاتمہ بھی ہو جائے اور اس کا خاتمہ ہمیں ہو جانا چاہیئے۔ تو ہمیں برطانی دوستی کا خاتمہ نہ کرنے دیجئے۔ برطانیہ کی ہمارے دلوں میں محبت ہے۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اسے قائم رہنے دیجئے۔

پہلے خدا اس کے بعد جارج پنجم

میں ایک کلمہ اس وقت اپنی حیثیت کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں کسی دوسرے موقعہ پر میں اس موضوع پر اپنے مفصل خیالات کا اظہار کرونگا انگلستان کے بہت سے لوگ ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ ہندو مسلم مسئلہ سیاسیات میں کیوں آجاتا ہے۔ اور اس کا ان باتوں سے کیا تعلق ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ مذہب کو سیاسیات سے خارج کر دینے کے معاملہ میں آپ نے مذہب کے متعلق ایک غلط خیال اپنے دلمیں جگہ دے رکھی ہے۔ مذہب صرف عقیدہ اور رسم کا نام نہیں ہے میرے نزدیک مذہب زندگی کے حقائق کا ترجمان ہے۔ مجھے اسلام کے صدقہ میں تہذیب معاشرتی نظام اور زندگی کا اُمید افزا مستقبل حاصل ہے۔ اسلام ان تمام باتوں کا مکمل مجموعہ ہے۔ جہاں خدا کے حکم کا سوال ہو۔ وہاں میں پہلے مسلمان ہوں اور آخری وقت تک مسلمان رہونگا۔ اگر آپ مجھے اسلام کی تہذیب معاشرتی نظام اور اخلاقیات کے بغیر اپنی سلطنت یا قوم میں داخل ہونے کے لئے کہیں تو میں کبھی داخل نہیں ہونگا۔ میرا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے خالق کا حکم مانوں نہ کہ ہز مجسٹی ملک معظم کا اور نہ اپنے رفیق ڈاکٹر مونجے کا۔ ڈاکٹر مونجے کا بھی پہلا فرض یہی ہے، جہاں تک کہ اس فرض کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر مونجے کو ہر چیز سے پہلے ہندو ہونا چاہیئے اور مجھے ہر چیز سے پہلے مسلمان ہونا چاہیئے۔

دو دائرے - اسلام اور ہندوستان

لیکن جہاں ہندوستان کا تعلق ہے۔ جہاں ہندوستان کی آزادی کا تعلق ہے۔ جہاں ہندوستان کی فلاح و بہبود کا تعلق ہے۔ میں پہلے ہندوستانی ہوں اور آخر وقت تک ہندوستانی رہونگا (نعرہ تحسین) میرا تعلق دو برابر کے دائروں سے ہے لیکن انکے مرکز علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک دائرہ ہندوستان ہے۔ اور دوسرا دنیائے اسلام۔ جب میں ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے انگلستان میں آیا تو میرے دوستوں نے کہا کہ "تمہارے خط و کتابت کے کاغذوں پر کوئی خاص نشان ہونا چاہیئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میرے کاغذوں پر دو دائروں کے نشان ہونگے۔ ایک دائرہ میں ہندوستان کا لفظ لکھا تھا اور دوسرے میں اسلام اور ہندوستان کے الفاظ درج تھے۔

قومیت کی جنگ اور دین کا جہاد

ہم مسلمانان ہندوستان کی حیثیت سے دونوں دائروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر دائرہ تیس کروڑ نفوس سے زیادہ کی آبادی کا ہے۔ ہم کسی دائرے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم قوم پرست نہیں ہیں بلکہ قوم پرستوں سے بھی کچھ اوپر ہیں۔ اور میں ایک مسلمان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ "خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوموں کو" قومیت انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے لیکن مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے۔ دنیا کی مذہبی جنگیں اور صلیبی لڑائیاں اس قدر تباہی خیز اور ہولناک نہ تھیں جیسی آپ کی گذشتہ جنگ عظیم تھی اور یاد رکھیئے وہ آپکی قوم پرستی کی جنگ تھی۔ میرے جہاد کی جنگ نہ تھی۔

غلط تاریخ کی تعلیم

لیکن جہاں ہمارے ملک کا تعلق ہے جہاں ٹیکس کے سوال کا تعلق ہے جہاں ہماری فصلوں کا تعلق ہے۔ جہاں موسم کا تعلق ہے جہاں ان تمام اداروں کا تعلق ہے جن سے روزمرہ کی زندگی کے ہزاروں معاملات وابستہ ہیں اور جو ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے ہیں۔ وہاں میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور فلاں ہندو ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کے متعلق کوئی غلطی نہ کیجئے' یہ جھگڑے ایک دوسرے کے تفوق کے دور پر مبنی ہیں اگر ہندوستانیوں کو کمزور اور نامرد بنانے کے علاوہ میں انگریزوں پر کسی دوسرے گناہ کا الزام عائد کرتا ہوں۔ تو وہ گناہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے متعلق غلط تاریخیں لکھیں۔ اور وہی تاریخیں ہمارے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدرسوں کے لڑکے ہندوستان کی غلط تاریخ کو اپنے دماغ میں جگہ دے لیتے ہیں جو بلوے بعض اوقات خاص تیوہاروں کے موقعہ پر گلی کوچوں میں رونما ہو جاتے ہیں وہ وہی ہیں جن کا تصور غلط تاریخ پڑھ کر ہمارے نام نہاد "روشن خیال" حضرات کے دماغوں کے اندر بٹھایا جاتا ہے۔ تاکہ اس سے سیاسی اغراض پورے ہوں۔ میرے نزدیک یہ حضرات روشن خیال نہیں ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ

اگر مسلمان ہر جگہ ۲۵ فیصدی کے حساب سے اقلیت میں اور ہندو ہر جگہ ۲۶ فیصدی کے حساب سے اکثریت میں ہوتے تو آج مجھے اُمید کی کوئی کرن نہ دکھائی دیتی لیکن بھلا ہو ہمارے اولیا اور مجاہدین کا اگر ایک طرف ہندوستان میں ایسے

صوبے ہیں۔ جیسا ہمارے دوست ڈاکٹر مونجے کا صوبہ ہے جسمیں ہم صرف ۴ فیصدی
ہیں تو دوسری طرف ایسے صوبے بھی ہیں جن میں ہم ۹۳ فیصدی ہیں جیسا کہ
میرے دوست نواب سر عبدالقیوم کا صوبہ ہے جس کے لئے ہم مساوی آزادی کا
مطالبہ کر رہے ہیں۔ سندھ کے پرانے صوبہ کو لیجئے۔ جہاں مسلمانوں نے سب سے پہلے
قدم رکھا اور جہاں ان کی تعداد ۷۳ فیصدی ہے۔ پنجاب میں وہ ۵۶ فیصدی
ہیں اور بنگال میں ۵۴ فیصدی۔ ان اعداد و شمار سے ہمارے حقوق کے تحفظ کی
صورت پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ ہم "ہندو یرغمالوں" کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جیسا ہم نے
اپنی رضامندی سے ہندوؤں کو ان صوبوں میں یرغمال دے رکھے ہیں۔ جہاں
ان کی بہت بڑی اکثریت ہے۔

ہندوستان میں اکثریت کا راج

میں چاہتا ہوں آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ آپ پہلی مرتبہ ہندوستان میں
ایک بہت بڑے انقلاب کو رائج کر رہے ہیں ہندوستان میں پہلی مرتبہ اکثریت کی
حکومت کا قاعدہ رائج ہونے والا ہے۔ مہاراج رامچندر کے زمانہ میں اکثریت کی کوئی
حکومت نہ تھی۔ محمود غزنوی۔ اکبر۔ اورنگزیب اور سیواجی کے زمانہ میں بھی اکثریت کی
حکومت نہ تھی جب ہندوستان میں ہسٹنگز اور کلائیو حکومت کر رہے تھے اسوقت بھی اکثریت
کا اقتدار نہ تھا۔ خود لارڈ ارون کے عہد میں بھی اکثریت کی حکومت نہیں ہے۔ ہم ہندوستان
میں بھی پہلی مرتبہ اکثریت کے اقتدار کو رائج کر رہے ہیں اور میں ایک اقلیت سے تعلق
رکھنے کے باوجود اکثریت کے اقتدار کو تسلیم کرتا ہوں۔ حالانکہ میں اچھی طرح سے جانتا
ہوں کہ اگر ۵ آدمی دو اور دو کو پانچ کہیں، اور ۴ یہ کہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں
تو ہر چند دو اور دو پانچ کہنے سے دو اور دو پانچ نہیں ہو جائیں گے لیکن پھر بھی

اکثریت کے اقتدار کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوں۔ اسلئے کہ خوش قسمتی سے بعض صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت بھی ہے۔

فیڈرل نظامِ حکومت

فیڈرل (ترکیبی) طرزِ حکومت جو ہندوستان کیلئے نہ صرف ہندو مسلم سوال کو حل کرنیکی غرض سے موزوں بلکہ والیانِ ریاست کے لئے بھی ضروری ہے۔ ہمارے حق میں ہے۔ ہندوستان میں ترکیبی اور وحدتی رجحانات کا توازن ایسا صحیح واقع ہوا ہے کہ ہم فیڈرل گورنمنٹ کے نظام کو کوئی دور دراز یا بعید نصب العین قرار نہیں دیتے جیسا گورنمنٹ ہند کہتی ہے۔ بلکہ ہم اس نصب العین کو عملی صورت میں آج دیکھنا چاہتے ہیں اور ابھی اسی لمحہ میں (نعرۂ تحسین) ہم اس کانفرنس سے صرف اسوقت جائیں گے جب ہندوستان میں فیڈریشن قائم ہو جائیگا۔ اور تاج اور والیان ریاست کے درمیان رضامندانہ معاہدات ہو جائیں گے

"اعلیٰ حضرت اور ادنیٰ حضرت"

میں بعض اوقات یہ سنتا ہوں کہ "والیانِ ریاست کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہیں "اعلیٰ حضرت" ! ہم "ادنیٰ حضرت" آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرینگے لیکن جب ۱۸۵۸ء کے خاتمہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات تاج برطانیہ کو منتقل ہو گئے تو اسوقت کسی شخص کو آپ کی رضامندی حاصل کرنیکا خیال نہ آیا کسی نے "آپ کی اجازت" سے فقرہ کا استعمال کرنے کی پرواہ نہ کی۔ آپ کے تعلقات انگلستان کے بادشاہوں کے خاندان سے قائم ہو گئے جو درحقیقت اچھے آدمی ہیں اور صرف اپنے ضمیر کے محکوم ہیں اور یہی وہ بات ہے جو ہمیں اُمید دلاتی ہے۔

فوج کے متعلق دلچسپ واقعہ

میں چند باتیں فوج کے متعلق بھی کہنی چاہتا ہوں اور پھر اپنی تقریر ختم کردونگا

میں اس وقت فوج کے متعلق ایک راز کا انکشاف کر رہا ہوں۔ آج سے دس سال قبل
جب ہز رائل ہائنس ڈیوک آف کناٹ ہندوستان میں مجالس قانون کی افتتاحی رسم ادا
کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ تو ہمارے عزیز دوست سی آر داس آنجہانی نے اس تقریب
پر گاندھی جی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ اور مجھ کو مدعو کیا تھا۔ آج اس میز پر ہماری آنکھیں
مسٹر داس کو تلاش کرتی ہیں۔ جو اگر زندہ ہوتے۔ تو آج گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو
کو اس کانفرنس میں ضرور لاتے۔ گاندھی جی اور میں مسٹر داس کے ہاں مہمان کی حیثیت
سے ٹھہرے ہوئے تھے میں گاندھی جی کا "لارڈ چیمبرلین" تھا۔ کثیر التعداد لوگ گاندھی جی
کو دیکھنے اور ان کے پاؤں کو چومنے کے لئے آتے تھے۔ ان لوگوں میں میں نے دس یا بارہ
لمبے قد کے آدمی دیکھے جن کے سروں پر پگڑیاں تھیں۔ انہوں نے کوئی وردی تو نہیں پہن
رکھی تھی لیکن باوردی سپاہیوں کی طرح معلوم ہوتے تھے میں نے خیال کیا کہ یہ غالباً محکمہ
سی آئی ڈی سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ جب میں ۱۹۱۵ء میں ایک ہمسایہ مخبر کی اطلاع پر گرفتار اور
نظربند کر دیا گیا۔ تو اس وقت سے میرا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں خدا نہ ہو
اور سی آئی ڈی والے نہ ہوں۔ پس جو کچھ میں کہتا ہوں اور جو کچھ میں کرتا ہوں اسے یقین کے ساتھ
کہتا ہوں کہ خالق اکبر اور سی آئی ڈی کے کارکن برابر حاضر و ناظر ہیں۔ میں ان مفروضہ مخبروں
کے پاس گیا اور ان سے کہا۔ فرمائیے میں آپ کی خدمت کیا کر سکتا ہوں۔ میں سڈیشن کی
شکل میں سی۔ آئی ڈی کے لئے بہت کچھ مصالحہ مہیا کرتا رہا ہوں۔ اور اگر ضرورت ہو تو
اب بھی مہیا کر سکتا ہوں (قہقہہ) انہوں نے کہا۔ "ہم سی آئی ڈی کے آدمی نہیں ہیں
ہمارا تعلق فوج سے ہے۔" اس پر میں نے ان سے پوچھا کہ "پھر اس مکان میں جہاں ہم
لوگ رہتے ہیں آپ کا کیا کام ہے؟" انہوں نے جواب دیا "...

کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہمارا تعلق اس گارد سے ہے جو ڈیوک آف کناٹ کے لئے پونہ سے آئی ہے۔" میں انہیں سیدھا گاندھی جی کے پاس لے گیا۔ گاندھی جی نے ان سے دریافت کیا۔" کیا تمہیں سوراج کی تحریک سے دلچسپی ہے؟" انہوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ (مولانا کھڑے ہوگئے۔) میں انگریزی فوج کے احترام کے خیال سے کھڑا ہوجاتا ہوں۔ اور ان سپاہیوں کے الفاظ کو دہراتا ہوں۔ گاندھی جی نے ان سے کہا۔ "کیا تم لوگو جن کا تعلق فوج سے ہے سوراج کی تحریک سے دلچسپی ہے؟ تمہیں؟ جو پونہ سے ڈیوک آف کناٹ کی حفاظت کے لئے یہاں لائے گئے ہو۔ کیونکہ فوجی افسر نہیں پریزیڈنسی (بنگال) کے لوگوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔"

فوج والے کیوں سوراج چاہتے ہیں؟

اس کے جواب میں سپاہیوں نے کہا۔" اگلے دن کی بات ہے کہ ہمارے کرنیل نے پریڈ میں ہنستے ہنستے ہم سے گاندھی جی کی نسبت یہ کہا۔ کیا تم جانتے ہو کہ بنیا گاندھی ہندوستان کے لئے سوراج چاہتا ہے؟ کرنیل ہنسا اور پھر اس نے ہم سے پوچھا کیا تم بھی سوراج چاہتے ہو؟ کرنل کو بلا شبہ ہم سے یہی توقع ہوگی کہ ہم سب کا جواب " نہیں جناب " ہوگا۔ لیکن رجمنٹ نے سکون و وقار کے ساتھ جواب دیا۔" ہاں جناب ہم بھی ہندوستان کے لئے سوراج چاہتے ہیں۔" اس پر کرنیل نے کہا جس کو یہ جواب سنکر سخت صدمہ ہوا تھا "تم کیوں سوراج مانگتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا۔" جب ہم یورپ میں لڑنے کے لئے بھیجے گئے تو ہم نے جین سپاہیوں کو دیکھا جو شکست کھا کر واپس آرہے تھے۔ وہ بڑے فخر سے۔ ہر اس شخص کو جو ان سے یہ پوچھتا تھا کہ تم کس ملک کے سپاہی ہو یہ جواب

دیتے تھے کہ ہم بلجین سپاہی ہیں۔ ہمارا تعلق بلجیم کی فوج سے ہے۔ اسی طرح فرانس کے سپاہی بھی جب بعض اوقات میدان جنگ سے بھاگ کر آتے تھے تو سوال کرنیوالوں کو بڑے فخر کے ساتھ یہی جواب دیتے تھے کہ ہم فرانس کے سپاہی ہیں۔ برطانوی سپاہی کا بھی یہی جواب تھا۔ لیکن ہندوستانی سپاہیوں نے کہا کہ "اس حالت میں بھی کہ ہم فتحیاب رہے اور ہم نے اکتوبر ۱۹۱۴ء میں ایک نازک موقعہ پر فرانسیسی ساحل کو دشمنوں کے نرغہ سے بچایا۔ اس سوال کے جواب پر کہ ہم کون ہیں۔ اسی فخر کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا تعلق ہندوستان کی فوج سے ہے ہمیں یہ کہنا پڑتا تھا کہ سرکار انگریزی کی فوج کے سپاہی ہیں۔"

دیکھئے! اب ان سپاہیوں نے بھی یہ کہا کہ وہ فخریہ انداز میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ "ہم ہندوستانی فوج کے سپاہی ہیں۔" میں کہتا ہوں یہ ہندوستانی فوج کے متعلق ایک امر واقعہ ہے۔ ایک آسمانی صداقت ہے۔ آپ اس معاملہ میں ہندوستانی فوج سے استصواب رائے کیجئے۔ خالق حقیقی بھی موجود ہو۔ اور انگریز مخبر بھی موجود ہوں (قہقہہ) لیکن اس موقعہ پر ہم میں سے بھی چند لوگ موجود ہوں۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے کہ ہمیں اس معاملہ کا زیادہ علم ہے۔ اور کوئی شخص ہم سے زیادہ باخبر نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ ایمانداری سے چاہیں کہ ہندوستان اپنی حفاظت کا بار اپنے سر لیلے تو وہ آج بھی اپنی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہے۔

ہندوستانی بھی حکومت کے اہل ہیں

حکومت ہند نے اپنے مراسلہ میں سر جان سائمن کی رپورٹ سے بھی ایک قدم

آگے بڑھایا۔ حکومت ہند نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فوج کو انگلستان کی گورنمنٹ کے ماتحت نہیں بلکہ حکومت کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ اس وقت حکومت ہند کے تین ارکان موجود ہیں۔ جن کے چمڑے کا رنگ وہی ہے۔ جو میرے چمڑے کا ہے۔ اور بعض کا تو میرے سے بھی زیادہ سیاہی مائل ہے۔ ان میں سے دونوں طالب علم کی حیثیت سے انگلستان میں میرے رفیق رہ چکے ہیں۔ اور تیسرے نے بھی اس وقت یہیں تعلیم پائی ہے۔ اگر یہ لوگ فوج کی نگرانی کرتے ہیں تو سر تیج بہادر سپرو ہندوستان کے وزیر اعظم کیوں نہیں ہو سکتے؟ سر محمد شفیع یا مسٹر جناح کیوں ہندوستان کے وزیر اعظم نہیں ہو سکتے۔ اور کیوں فوجی معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے؟ یا مجھ جیسا حقیر آدمی یا میرا بڑا بھائی کیوں ہندوستان کا سپہ سالار نہیں ہو سکتا؟

اس میں شک نہیں کہ میری تقریر سے آپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہوگا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری تقریر خود میرے لئے بھی صبر آزما اور جامع ہے۔

میں اب بیٹھا جاتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ مجھے کانفرنس کے بھرے اجلاس میں اس وقت تک دوبارہ تقریر کرنے کے لئے طلب نہیں کیا جائیگا جب تک جناب صدر یہ اعلان نہ کر دیں گے کہ ہندوستان بھی۔ انگلستان کی طرح آزاد ہے۔ (ماخوذ)
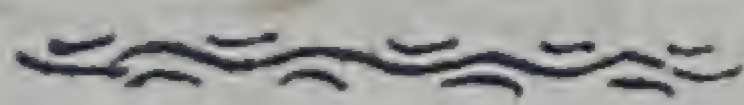
مولانا محمد علی کی وفات

بستر مرگ کا دردناک منظر

مولانا کی ایمانی قوت نے مولانا کی سکرات کو اس درجہ آسان کر دیا تھا کہ آخری وقت کرب و بے چینی کی علامات آپ کے چہرے سے نمایاں نہیں ہوئیں۔ اور نہ آپ کی باتوں سے معلوم ہو سکا کہ آپ کا آخری وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ "ڈیلی ایکسپریس" لندن کے اخبار کا بیان ہے کہ "میں اپنے وطن عزیز کی آزادی اور سرسبزی، خوشی اور امن و سکون کا خواہشمند ہوں۔ اور دنیائے اسلام میں ایک عالمگیر اتفاق و اتحاد کا متمنی" یہ آخری الفاظ تھے جو مولانا محمد علی رح کی زبان پر مرتے دم جاری رہے۔

مولانا محمد علی موت کے آغوش میں انگلستان تشریف لائے۔ تاکہ گول میز کانفرنس میں شمولیت کر کے اپنے ملک و ملت کی بہترین خدمات انجام دیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آخری وقت بالکل قریب ہے۔ اور ان کو بتایا گیا تھا کہ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے لیکن باوجود اس کے روحانیت کے جذبہ کے ماتحت جو اہل مشرق سے مخصوص ہے آپ نے اپنی زندگی کی آخری شب بھی ڈیلیگیٹوں کو اپنا آخری اور الوداعی پیغام لکھوانے میں بسر کر دی۔ تاکہ جس طرح بھی ہو سکے فرقہ وارانہ پیچیدگیاں سلجھ جائیں اور اس طرح وہ اپنے وطن کی آخری خدمت انجام دے سکیں۔

آپ نے ہائڈ پارک لندن ہوٹل میں ۱۴ رشعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کی صبح کو اس حالت میں داعی اجل کو لبیک کہا کہ آپ کا ایک ہاتھ اپنی عاشق زار بیگم کے ہاتھ میں اور دوسرا اپنے شیدائی برادر بزرگ مولانا شوکت علی کے ہاتھ میں تھا۔

جو تمام رات سفر کرتے ہوئے موت سے چند ہی گھنٹے پہلے پہنچے تھے۔ آپ کے بالیں پر والیان ملک اشکبار تھے۔

ہندوستانی شہزادے بار بار کمرے میں آتے تھے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے لیکن آہ موت کا وقت کہیں ٹلتا ہے۔ وہ تو لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون کی مستحکم قید میں ہے۔ آخر آ ہی پہنچی۔ اور ہندوستان کا یہ قائد اعظم اپنی عمر کے ۵۳ سال گزار کر ابدی نیند کے مزے لینے لگا۔ اس مسافر راہ عدم نے غالب کے اس مصرعہ کو اپنے شعر میں دہرا کر اپنی مسافرانہ موت کی پیشین گوئی کی تھی ع "مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور"

افسوس وہ پُر درد آواز جو سنہ ۱۹۱۱ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بنکر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ وہ بیقرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت پہ بیتاب ہوجاتا تھا اور دوسروں کو بیتاب کر دیتا تھا۔ قیامت تک کے لئے ساکت ہوگیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین وملت کے ہر ماتم میں اشکوں کے دریا بہایا کرتی تھیں ان کی۔ وائی ہمیشہ کیلئے بنار ہو گئی۔ وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بنکر چہکتے تھے۔ ابد الآباد تک خاموش ہو گئے وہ آتش بیاں زبان جو ہر وطنی اور ملی رزم میں تیغ براں بنکر چمکتی تھی۔ اب اس کی تابش ماند پڑ گئی۔ وہ پُر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بنکر بہا لیجاتا تھا اب اس کا تلاطم پیدا کرنے والا جوش ہمیشہ کے لئے رک گیا۔ وہ پُر زور دست وبازو جو ملت وطن کی خدمت گذاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے شل ہو گئے۔ افسوس ہزار افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری دلیر سپاہی جو اعداء کے نرغہ میں آیا ہوا

تنہا مقابلہ کر رہا تھا۔ آخر زخموں سے چور چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر نہ کھڑا ہو گا۔ الوداع الوداع محمد علی الوداع، والسلام اے یوم القیام۔

تو ملت کا عزادار تھا۔ حق ہے کہ آج ساری ملت تیری عزادار ہو، تو امت محمدی کا سوگوار تھا۔ فرض ہے کہ آج تمام امت محمدی تیرا سوگ کرے۔ تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا۔ سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے تو ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لئے غمزدہ، بلقان کے لئے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں حجاز کا سوختۂ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم تھا۔ اے ہندوستان کے آوارہ گرد مسافر تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ اس لئے حق یہی تھا کہ تیرے غم میں اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔

مولانا محمد علی کا مزار

مولانا کی وفات کی خبر بجلی کی طرح آناً فاناً تمام عالم میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے ہر دیار و امصار میں ماتمی صفیں بچھ گئیں۔ اور جنازہ کا انتظار بڑی بے چینی کے ساتھ کیا جانے لگا۔ کہ ارباب وطن کو مولانا کا آخری دیدار کرنے کا موقعہ ملے گا۔ کہ اسی دوران میں اطلاعات موصول ہوئیں۔ کہ مولانا کی تدفین آپ کی خواہش کے مطابق جس کو تمام دعاؤں اور آرزوؤں کی قبولیت کے ساتھ خداوند کریم نے درجۂ اجابت عطا فرمایا ہے۔ بیت المقدس مسجد سیدنا حضرت عمر رضؓ میں ہو گی۔ جو اسلام کا اولین قبلہ ہونے کی حیثیت سے مکہ معظمہ اور جنت البقیع سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ واقع ہوئی کہ مرحوم کے اعزا میں سے پسماندگان سے سید امین الحسینی نے درخواست کی کہ وہ مولانا کی میت حرم قدس میں دفن کرنے کی

اجازت دیں۔ جسے فراخ دلی کے ساتھ آپ کے پسماندگان نے منظور کر لیا۔

لندن سے پورٹ سعید

اور شہید ملت کی نعش ۹۔ جنوری کو بعد نماز جمعہ لندن سے بندرگاہ ٹلبری کو روانہ ہوئی۔ جہاں پی ان او کمپنی کے جہاز "نارکنڈہ" کا ایک کمرہ تابوت کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ روانگی کے وقت نعش کو رخصت کرنے کے لئے گول میز کانفرنس کے تمام مسلم مندوبین اور وزیر اعظم دوز(؟) کے قائم مقام موجود تھے۔ جن کی طرف سے تابوت کو ہاروں سے آراستہ کیا گیا۔ ہر شخص اس نظارہ سے متاثر تھا۔ اور بعض آبدیدہ تھے۔ نعش اسی دن ٹلبری پہنچ گئی۔ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے شہید ملت کی نعش کو اس کے آخری آرام گاہ تک پہنچنے میں پوری مدد دی گئی۔ ۱۳۔ جنوری کو جہاز "نارکنڈہ" مارسیلز پہنچا۔ اور ۱۵۔ جنوری کو جزیرہ مالٹا۔ مولانا مرحوم کے سب اہل خاندان اسی جہاز پر سوار تھے۔ مالٹا کے کثیر التعداد مسلمانوں نے جہاز پر پہنچکر۔ اپنے پیارے شہید کی آخری زیارت کی۔ مالٹا سے اسی روز جہاز روانہ ہوا۔ اور ۲۰۔ جنوری کو پورٹ سعید پر پہنچا۔

پورٹ سعید میں شاندار خیر مقدم

ہز مجسٹی مصر نے سرکاری طور سے مرحوم کے خیر مقدم کا حکم دے رکھا تھا۔ پورٹ سعید کا کمشنر خیر مقدم کے لئے موجود تھا۔ سرکاری فوج آگے آگے چل رہی تھی اس کے پیچھے تابوت تھا۔ تابوت کے پیچھے نائب جلالۃ الملک، نائب رئیس الوزراء نائب رئیس الوفد امراء اور شیوخ اور دیگر بڑے بڑے سرکاری عہدہ دار و اکابرین مصر تھے۔ اور عوام الناس ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ریل کی پٹری کے دونوں جانب ہزارہا عرب کھڑے تھے۔ بینک سینما کمپنی مصر کی طرف سے عبد العظیم آفندی نے اس

تاریخی جلوس کی فلم لی۔ ان کے علاوہ دوسرے مصورین نے جلوس کی تصاویر لیں۔

شہید ملت کی تدفین

فلسطین سے ایک نامہ نگار رقمطراز ہے کہ ۲۳۔ جنوری ۱۹۳۱ء کا تاریخی دن قیامت تک مسلمان عربوں کو یاد رہے گا۔

ایک مخصوص ٹرین تابوت کو مصر سے یروشلم لائی۔ دو اور اسپیشل ٹرینیں جو کھچا کھچ بھر گئی تھیں مصر سے چھوڑی گئیں۔ ان کے علاوہ فلسطین سے جو موٹریں آئیں وہ اتنی زیادہ تھیں کہ موٹروں کے اسٹیشنوں پر جگہ باقی نہ رہی اور تقریباً ۶ میل تک قطار در قطار صف آرا ہو گئیں۔

جس راستہ سے تابوت گزرنے والا تھا۔ اس کی ہر ایک بلندی پر لاکھوں مسلمان خواتین جمع ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ شہر کے میناروں۔ برجوں اور پشتیبانوں تک مسلمان خواتین ہی نظر آتی تھیں۔ اور مسجد اقصیٰ کے گرد جو چھتیں۔ بالاخانے۔ کمرے اور برآمدے تھے ان میں بھی خواتین بھری ہوئی تھیں۔ رہے مرد سو وہ ہر جگہ سڑکوں پر مرد ہی مرد نظر آتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کے ٹھٹ لگے تھے۔ جلوس میں ان کا جم غفیر شریک تھا۔ ان کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ مسجد میں جہاں نماز جنازہ ہوئی اور جس کا رقبہ ۲۶ ایکڑ تھا۔ وہ گویا کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

عیسائی عرب مرد اور خواتین دونوں جلوس کے مجمع میں موجود تھے یہاں تک کہ وہ خواتین جن کی گود میں بچے تھے وہ بھی گھروں میں نہ بیٹھ سکیں۔ اور کمسن بچے بھی ہزاروں کی تعداد میں اونچے اور نیچے مقامات پر چڑھ گئے تھے اور حیرت کی بات یہ ہے

کہ کوئی حادثہ رونما نہ ہوا۔

میت کے ساتھ جو رنج وغم کا اظہار عام ہوا کرتا ہے۔ اس کے برخلاف یہاں رنج وغم کی بجائے کل حاضرین میں گویا ایک کامیابی و فتح کا جذبہ موجزن تھا کہ گویا ایک مسلم لیڈر اور ایک محب وطن ان کے ساتھ قیام کرنے کے لئے آیا۔ اور اگرچہ وہ مرچکا ہے۔ تاہم لوگ سمجھتے تھے کہ اسلامی ہند اور مسلمانان فلسطین کے درمیان ایک طاقتور رشتہ بندھ رہا ہے۔

کاروبار تو بالکل معطل ہی تھا کیونکہ کارخانوں کے تمام کاریگروں نے شریک جنازہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے تمام کارخانے بند رہے۔ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگ اس کشمکش میں مبتلا تھے کہ ہم بھی میت کو کندھا دے سکیں۔ میت کا جلوس ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا۔ اور پرانے شہر کا چکر کھاتا ہوا دمشقی دروازہ پہنچا اور وہاں سے مسجد اقصیٰ چلا گیا۔

سب سے پہلے تابوت مسجد عمرؓ میں پہنچایا گیا۔ اور وہاں سے گزر کر مسجد اقصیٰ میں پہنچا۔ یہاں نماز ظہر ادا کی گئی۔ حاضرین کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ مسجد اقصیٰ کا وسیع رقبہ ناکافی ثابت ہوا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ کے مدرسے منبر سے مرحوم کو زبردست خراج تحسین ادا کیا گیا۔ متعدد تقریریں ہوئیں۔ آخری تقریر مرحوم کے بھائی مولانا شوکت علی صاحب کی تھی۔

جس شہر میں تابوت مصر سے یروشلم پہنچا تھا۔ وہ یہاں ساڑھے نو بجے پہنچی تھی

کمیونسٹ اشتراکین کی حرکات مذبوحی

یوروشلم ۔ ۲۳ ۔ جنوری ۱۹۳۱ء کمیونسٹ اشتراکین کی جماعت نے مولانا مرحوم کے جنازہ پر گڑبڑ کرنے کی سازش کی تھی ۔ اور اس میں بیان کیا جاتا ہے کہ عرب عیسائی اور یہودی دونوں شامل تھے ۔ بہت سے ان میں سے گرفتار بھی کر لیئے گئے خدا کا شکر ہے کہ مراسم تجہیز و تکفین امن و سکون کے ساتھ سرانجام پائیں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی

بیت المقدس سے مولانا شوکت علی کا برقی پیغام

بیت المقدس ۔ ۲۰ ۔ جنوری ۱۹۳۱ء ۔ مصری حکومت نے رئیس الاحرار کے تابوت کی گاڑی ۔ دوپہر سے ایک خاص پل کے ذریعہ بھیجی جو قنطرہ پر فلسطین کے ریل کے ساتھ جوڑ دی گئی ۔ ہز ہائی نس ہائی کمشنر نے ہم لوگوں کے لیئے اپنا سیلون بھیجا ہوا تھا گاڑی جس اسٹیشن پر بھی ٹھہرتی تھی مصری معززین تدفین میں شرکت کیلئے گاڑی میں سوار ہوتے جاتے تھے ۔ اور ہزاروں کی تعداد میں عرب مرد اور عورتیں ہر اسٹیشن پر آتے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ تدفین میں شریک ہونے کیلئے گاڑی میں سوار ہوتے جاتے تھے ۔ اندر باہر چھت پر غرض ہر جگہ آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے ہزاروں آدمی لُد جنکشن پر اپنی موٹر لاریوں میں پہنچے ۔ لُد ہم سے ملنے کے بعد بیت المقدس تک کا سفر سڑک کے ذریعہ طے کیا ۔ ریل کی پٹڑی کے دونوں جانب ہزارہا عرب گزرتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہے تھے ۔ جب تابوت بیت المقدس پہنچا تو مجمع اس قدر بڑھ گیا کہ ہم بمشکل تابوت گاڑی سے نکال سکے

خلوص و عقیدت کا نظارہ

مسلمانوں، عیسائیوں اور خواتین کے وفد "بیگم صاحبہ" مولانا محمد علی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواتین فلسطین کی جانب سے ایک خوبصورت کڑھی ہوئی چادر تابوت کے لئے پیش کی گئی۔

دو لاکھ سے زیادہ مرد عورتوں کا مجمع تھا جو جلوس کی صورت میں اسٹیشن سے حرم شریف تک تابوت کے ساتھ آیا۔ سڑکوں کے دونوں طرف مکانوں کی کھڑکیاں اور چھتیں آدمیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ ہر طرف آدمیوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے یہ جلوس تقریباً ڈیڑھ میل تک مسلسل رہا۔ لوگوں کو سڑکوں پر سے گزرنا مشکل ہو رہا تھا تابوت کوئی تین گھنٹے میں حرم شریف پہنچا سب قوموں کے معززین۔ برطانوی حکومت کا نمائندہ امیر عبداللہ و شاہ حسین کے قونصل اور شہر کے پراٹسٹنٹ اور یک چرچ کے مذہبی پیشوا اس وقت موجود تھے اور سب نے تعزیت ادا کی۔

نماز جنازہ اور تقاریر

بعد نماز جمعہ جنازہ کی نماز پڑھی گئی مسجد اقصیٰ کے اندر باہر اور سارے صحن میں مردوں اور عورتوں کا بڑا زبردست مجمع تھا۔ ہزاروں عرب خواتین کی موجودگی جو چار رچار کی صورت میں برقعہ اوڑھے صف بستہ کھڑی تھیں۔ نہایت متاثر کن تھی۔ تابوت صخرہ شریف کے آگے رکھا گیا۔ اور تمام مشہور مسلمانوں نے آخری تقریریں کیں جن میں امین حسینی مفتی اعظم، ذکی پاشا، عبدالحمید سعید، علامہ چرحا ہو اور دوسرے نمائندے بھی شریک تھے۔ مارشو سفر ندیم

اور علماء تو بعض نے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ اور مولانا شوکت علی صاحب نے جمال حسینی کی مدد سے حاضرین کو مخاطب کیا۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ اسلام کے اس بڑے کام کو مکمل کرنے کے لئے مستعد ہو جائیں جس کو مولانا محمد علی نے اب تک کامیابی سے چلایا ہے۔ اس پر مختلف سمتوں سے نوجوان مسلمانوں کی آوازیں بلند ہوئیں جنہوں نے کہا کہ وہ ہر طرح ایثار کے لئے تیار ہیں۔ اپنی جان۔ اپنا مال۔ اپنا وقت سب کچھ وہ اپنے مذہب کے لئے قربان کرنے کو آمادہ ہیں۔

حقیر ہدیہ

مولانا شوکت علی نے کہا کہ مولانا محمد علی کی نعش مسلمانان ہندوستان کی طرف سے ایک حقیر سا ہدیہ ہے۔ اس خدمت کا جو عرب اقوام ساری دنیا میں علم کی روشنی پھیلانے میں کرتی رہی ہے۔

خطیب خاندان نے مسجد اقصیٰ کے قریب اپنی مسجد میں تدفین کے لئے جگہ پیش کی۔ اور مفتی اعظم کی کوشش سے سب انتظام عمدگی سے انجام پایا۔ اس دفعہ جیسا زبردست مجمع ہوا اور جس شان کا جلوس مرتب ہوا۔ نہ بیت المقدس میں ایسا کبھی دیکھا گیا تھا اور اس کی تاریخ میں اس کی نظیر ہے۔ ہزاروں آدمی قرب وجوار کے دیہاتوں سے آ کر قبر پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔

بیگم صاحبہ مولانا محمد علیؒ کی واپسی

بیگم صاحبہ مولانا محمد علیؒ مسٹر زاہد علی کے ساتھ بندر معید واپس انگلینڈ ۲۴ جنوری کو وہ

وائسرائے آف انڈیا کے ذریعہ سے روانہ ہو کر ۶ فروری ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچیں۔ مولانا شوکت علی صاحب ایک ہفتہ کے لئے قاہرہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے اسکندریہ، حیفہ بیت المقدس، بیروت، دمشق، کربلائے معلی۔ بغداد، نجف اشرف ہوتے ہوئے وارد کراچی ہوئے۔

شہید ملت کا عالمگیر ماتم

ہے ابر چرخ پر بھی یہ غم ہے آج کس کا ہر شخص رو رہا ہے ماتم ہے آج کس کا

یہ کون نہیں جانتا کہ موت اپنے وقت پر ضرور آتی ہے۔ اور جو پیدا ہوتا ہے آخر وہ مرتا ہے مگر موت، موت میں بھی فرق ہے۔ ایک شخص مرتا ہے کہ اس کے مرنے کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ چند اعزہ اقربا جمع ہوتے ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں سے کچھ رونے کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ جنازہ جاتا ہے اور سکوت وجمود طاری ہو جاتا ہے۔ شہر تو شہر محلہ میں بھی سوائے معدودے چند کے اور کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ دوسرا مرتا ہے کہ اس کے مرنے کا چرچا سارے شہر میں ہوتا ہے جنازہ پر اژدحام عام ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص بڑا اچھا تھا۔ کہ اس کے جنازہ کی نماز اس قدر آدمیوں نے پڑھی۔

ایک موت ایک صوفی کی ہوتی ہے۔ لوگ اس کے مرنے پر اس لئے اظہار غم کرتے ہیں کہ فیضان قدسی کے حصول کا ایک دروازہ بند ہو گیا۔ ایک موت ایک بادشاہ یا امیر کی موت ہوتی ہے کہ عزیز اور اقربا تک اس کے مرنے سے بظاہر ملول مگر دل میں خوش ہوتے ہیں کہ اب حکومت یا دولت کے خزانوں کی کنجی ہمارے ہاتھ میں آئے گی۔ مگر سب سے بڑی موت ایک عالم کی موت ہے۔ جس کی بابت کہا گیا ہے۔ مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ۔

اس لئے کہ اس کے مرنے سے سب اغراض و مقاصد خواہ دینی ہوں یا دنیوی معرض ہلاکت میں پڑ جاتے ہیں۔ اور جس قدر بھی اہل دنیا ان باتوں کی جو محض اس کی ذات سے وابستہ تھیں دوسرے میں تلاش کرتے ہیں نہیں ملتیں۔ یہ موت حقیقۃً ایسی موت ہے جس کا ماتم اگر ساری دنیا کرے تو کم ہے۔ اور اس کے سوگ کی مجلسیں اگر سہر دیار و امصار میں بچھیں تو بجا ہے آدمی مرتا ہے۔ آدمی پیدا ہوتا ہے۔ مگر ایسے آدمی کا مرنا جو اپنا قائم مقام نہ چھوڑے قوم کے لئے نقصان عظیم اور گم گشتگی عزیز کا مترادف ہے۔ آہ مولانا محمد علی کے ارتحال نے یہی بار عظیم اپنی قوم پر آج ڈال دیا۔ مانا کہ قدرت کی فیاضی کسی کو محروم نہیں رکھتی مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ؎

سالہا باید کہ تا از محنت و فضل خدا
عالم دانا شود یا شاعر شیریں سخن

قرنہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

یہی وہ بات ہے جس نے آج مولانا محمد علی کے غم میں نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان ترکی مصر فلسطین۔ شام عراق۔ نجد و حجاز و ایران و افغانستان کو سوگوار بنایا۔ آہ محمد علی!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سید امین حسینی مفتی اعظم و صدر مجلس اسلامی اعلیٰ فلسطین

محمد علی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب کچھ قوم و ملت اور اسلام کے لئے قربان کر دیا۔

ایک ترک فاضل کا تعزیت نامہ

جناب حاجی محمد زکریا ترک سابق انسپکٹر جنرل شعبۂ تعلیمات افغانستان۔ آج کل لاہور میں تشریف فرما ہیں۔ اور عنقریب اپنے وطن ہمزاکو روانہ ہونے والے ہیں۔ آپ روزنامہ ترکیہ جمہوریہ کے نمایندے بھی ہیں۔ آپ نے رئیس الاحرار کے انتقال پر حسب ذیل تعزیت نامہ لکھا،

بلاشبہ محمد علی شہید علیہ الرحمۃ والغفران ہندوستان کی وسیع غلام سرزمین میں تحریک حریت کے اولین بانی اور موسس تھے۔ آپ کے اوصاف جمیلہ اور خیالات عالیہ اور آپ کے مجاہدات تمام عالم اسلامی کے نزدیک معلوم و مسلم ہیں۔ چونکہ آپ وجود مقدس کی جدوجہد سے ترکوں نے بھی بارہا فائدہ اٹھایا ہے اور آپ ہی جیسے بزرگوں کی برکت سے آج ترکی قوم کامیاب وکامراں ہے۔ اس لئے اسلام کے اس خادم حقیقی کے انتقال پر اظہار افسوس میں ترک بھی اپنے ہندی بھائیوں کے ساتھ شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے مرقد کو نور علیٰ نور بنائے کیونکہ شہید معظم اپنی زندگی میں بلاشبہ نور الاسلام تھے۔ اس مختصر سے تعزیت نامے کے آخر میں مسلمانان ہند کے ساتھ شریک ہوکر یہ دعا مانگتا ہوں کہ رب العالمین اس فدا کار ملت و وطن شہید معظم کے بوئے ہوئے تخم کو نعم البدل اور خیر الخلف عطا فرمائے۔ تاکہ اس رہنما و امت رئیس الاحرار وطن پرور معظم کا لگایا ہوا پودا برباد نہ ہونے پائے۔

وما توفیقی الا باللہ۔

کابل میں مجلس عزا

اگرچہ کابل میں مولانا محمد علی مرحوم کے انتقال کی خبر دیر میں پہنچی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس خبر حسرت اثر نے ہر طرف رنج و افسوس اور غم و الم کا وہ سماں باندھ دیا کہ شاید ہندوستان کے بھی کسی شہر یا خطہ میں اس سختی سے محسوس نہ کیا گیا ہوگا۔ جب عام پبلک کا یہ حال تھا تو آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان سینکڑوں مہاجرین پر کیا کچھ گزری ہوگی۔ جو مختلف اوقات میں اپنے وطن عزیز سے ہجرت کرکے اس آزاد و پایہ صدہا نذ اسلام در شرقیا مرکز افغانستان میں سالہا سال سے پناہ گیر ہیں وہ [illegible] خبر کے سنتے ہی جناب عالی [illegible] جلالتماب مولوی اللہ نواز خاں یاور حضور شاہانہ کے دولتکدہ پر مشورہ کے لئے حاضر ہوئے۔ [illegible]

...یا کہ ۲۷ شعبان بروز شنبہ ... بجے بعد دوپہر مسجد پل ... میں جمع ہوکر مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے تیس حفاظ جمع کر کے قرآن مجید کا ختم کیا جائے اور ڈھائی بجے سے عمومی طریق پر ... پڑھی جائے۔ چنانچہ وقت معینہ پر حسب اعلان جناب مولانا سیف الرحمن صاحب و مولانا منصور و مولانا فضل الٰہی جناب شاہ جی صاحب رئیس قبائل جات حربی سردار محمد اسلم بلوچ و سردار مصری خاں بلوچ وپیر رحمت اللہ ہمایوں اور محمد یعقوب حسن صاحب مہاجر اور مولوی عبدالرزاق صاحب جملہ اکابر و عموم مہاجرین نیز اکثر ہندوستانی ڈاکٹر صاحبان۔ پروفیسر اور دیگر سوداگر و کاریگر بھی مسجد مذکور میں جمع ہوگئے۔ جو ملازمت و کاروبار کے سلسلہ میں مدتوں سے کابل میں خدمات مفوضہ ادا کر رہے ہیں۔ مہاجرین مقیم کابل کے علاوہ چونکہ جناب گرامی علامہ محترم مولانا البشیر صاحب (صدر جمعیۃ عالیہ مجاہدین ہندیہ چمرکنڈ) حسن اتفاق سے کابل میں موجود تھے۔ انہوں نے بھی شرکت فرمائی اور عین اس وقت جبکہ قرآن شریف کا ختم پورا ہونے کو تھا۔ جناب عالی قدر صداقت مآب غلام قادر خاں رئیس بلدیہ شہر بھر کے رؤسا و معتبرین اور رئیس دار العلوم عربیہ و مدیر صاحبان اخبارات کی معیت میں تشریف لائے اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت میں شرکت فرمائی

صدر اعظم اور وزراء کی شرکت مجلس عزا اسی اثنا میں حضور شاہانہ کی خصوصی شاہی اور محکمۂ عساکر کا ایک ٹولہ اپنے منصب داروں ہمیت دروازہ مسجد پر پہنچ گیا کہ حضور انور خود تشریف فرما ہونے کو ہیں اور جلد آیا چاہتے ہیں۔

اللہ اکبر اسلام مقدس کو خدائے پاک، ولا زوال نے وہ غیر معمولی شرف دیا ہے

کہ چند عقائد [illegible] رکالے بادشاہ یا اور گدا
فقیر اور امیر غرض ہر قسم کے انسانوں کو ایک ہی مساوی درجہ پر لاکر کھڑا کر دیا۔ غور کا
مقام ہے۔ کہاں ہم غربا، بے وطن مہاجرین اور کس ملک کے حضرت مولانا محمد علی مرحوم
مگر آج اس خوش نصیب ملک کا بلند طالع اور ملکی صفات بادشاہ۔ جو خیر و خوبی کے کاموں
اور فلاح عامہ اور بنی نوع انسان کے ہمدردیں اہل عالم کے پیش پیش رہ کر شان پیشوائی
ومقتدائی کا ثبوت بہم پہنچا رہا ہے۔ یہ خبر پاکر آج اس کے شہر کے دارالسلطنت میں
ایک سچے خادم اسلام و وطن کے لئے فاتحہ پڑھی جا رہی ہے۔ وہ قومی رنج و اندوہ میں
مخلصانہ شامل ہو رہا ہے۔

اس عسکر اول کے چند دقیقہ بعد ہی موٹروں کی قطار مسجد کے شاندار دروازہ پر آکھڑی
ہوئی۔ اور ان میں سے نہ تنہا جناب عالی قدر جلالتماب سردار صدر اعظم محمد ہاشم خاں بلکہ
جملہ وزراء دولت وزیر خارجیہ، داخلیہ، معارف، تجارت، مالیہ اور رئیس صاحب
شورائی ملت وغیرہ مسجد میں داخل ہوئے اور بقرار قاعدہ ایک قاری صاحب نے قرآن مجید
کا ایک رکوع تلاوت کیا۔

صدر اعظم کابل کی تقریر

والا حضرت صدر اعظم نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھانے
سے قبل اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ عزم مصمم
دیکھنے اور سب انتظامات درست ہو جانے کے باوجود چونکہ وقت معینہ سے کچھ ہی قبل برف
و باد شروع ہو گئی۔ اس لئے حضور شاہانہ بہ نفس نفیس تشریف نہ لا سکے لیکن مجھے حکم فرمایا
ہے۔ کہ نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ خود حضور شاہانہ کی جانب سے بھی آپ کے ساتھ اس
زہرہ گداز سانحہ میں شریک رنج و غم ہو کر دعائے مغفرت کروں۔ اگرچہ خود لندن اور

بلجه میں ہماری دولت کے وزیر مختار سردار امین ... اللہ خاں مولانائے مرحوم کے جنازہ کے ساتھ شامل ہو کر ہم سب کی نیابت کا فرض ادا کر چکے ہیں۔ تاہم چونکہ مولانائے مرحوم عالم اسلام کے ساتھ ہی ساتھ افغانستان اور ہمارے خاندان سے بالخصوص مودت رکھتے تھے۔ اور اسی الفت و محبت کا نتیجہ تھا کہ جب ہم تینوں (میں، اور حضور شاہ محمود اور شاہ ولی اللہ خان) پچھلے دنوں پیرس سے ہندوستان آئے تو دہلی سے لاہور تک مولانائے مغفور ریل میں ہمارے ساتھ ہی رہے۔ اس لئے ایسے جلیل القدر شخص پر جس نے اغراض ذاتی سے بالا ہو کر اپنی ذات کو مفاد عامہ اور مصالح عمومی کے لئے وقف کر کے ساری عمر رنج و زحمت کا تحمل کیا ہو۔ جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ ہم آج پھر اس فاتحہ خوانی میں شریک ہونے کے لئے آ گئے ہیں اور دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

دیگر حضرات کی تقریریں

صدر اعظم کی تقریر کے بعد عالی قدر جلالت مآب سردار فیض محمد خان وزیر خارجیہ نے سارے کابینہ کی جانب سے مولانائے مبرور کے اوصاف جمیلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی وفات حسرت آیات پر اظہار تاسف کیا۔ اور مکرر دعائے مغفرت کی۔ ان ہر دو حضرات کے پاکیزہ خیالات کے اظہار پر جناب مولانا سیف الرحمن خان اور سردار محمد اسلم خاں بلوچ نے بھی مختصر مگر برجستہ اور پر زور تقریریں فرمائیں۔ اور دوبارہ دعا کر کے اور جملہ اکابر مہاجرین سے مصافحہ فرما کر جناب صدر اعظم اور دیگر وزرائے کرام تشریف لیگئے اور ان کے بعد جلد ہی عالی قدر جلالتمآب سردار احمد شاہ خاں وزیر دربار فوکانہ اور نائب سالار محمد نعیم خاں صاحب بعض دوسرے ارکان دولت کی رفاقت میں تشریف لائے اور حسب معمول تعزیت اور دعا کے بعد تشریف لیگئے۔ الغرض شام تک روساء و اکابر

کے آنے … ی عمیق برف باری میں با…
شام تک مسجد کے دروازے پر قطار باندھے کھڑا رہا۔ اور شام کی نماز کے بعد آخری دعا کر کے اکابر مہاجرین بھی رخصت ہو گئے۔

لارڈ ریڈنگ مولانا محمد علی زبردست قوت عمل کے مالک تھے اور وہ اپنے عقائد کو نہایت پختگی کے ساتھ اہل ہند کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان کی ہمت اور جرات کو دیکھتے ہوئے ہمارے قلوب میں تعریف و توصیف کا جذبہ موجزن ہے۔

سر جارج لینے رکن حکومت ہند مولانا محمد علی نے ملک و قوم کو اپنی مشکلات پر ترجیح دی اور بالآخر ملک و وطن پر فدا ہو گئے۔

مسٹر آرتھر مور یورپین ممبر اسمبلی مولانا محمد علی ایک شیر دل سپاہی تھے یورپین لوگوں کو مولانا کی وفات سے انتہائی رنج ہے۔ جتنا دوسرے لوگوں کو۔

سر ہری سنگھ گوڑ رکن اسمبلی مولانا محمد علی نے ہندوستان کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ ہند کے صفحات پر ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ہندوستان اور بیرون ہند میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مرحوم کی حب الوطنی سے انکار کر سکے

میاں شاہ نواز رکن اسمبلی مولانا محمد علی بہادر انسان۔ جری سپاہی اور آزادی کے عاشق تھے۔

سر تیج بہادر سپرو میں مولانا محمد علی سے تیس سال سے واقف تھا ان کی شخصیت شاندار اور زوردار تھی اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے ملک سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور ان کی وفات ایسے وقت میں ہوئی ہے جبکہ ہندوستان کو ان کی اشد ضرورت تھی۔

سر اکبر حیدری مولانا محمد علی نے اپنی زندگی ... ملک کی خدمت کی۔

انگلستان کا مشہور مصنف ایچ جی ویلز مولانا محمد علی کا دل نپولین کا دل ہے۔ مولانا محمد علی کی زبان برک کی زبان ہے اور مولانا محمد علی کا قلم میکالے کا قلم ہے۔

مسٹر ویجوڈ بین وزیر ہند محمد علی ایک جلیل القدر مسلمان ایک زبردست محب وطن اور عالم انسانیت کے عظیم القدر پیشوا تھے۔

لارڈ پیل سابق وزیر ہند مولانا محمد علی میرے رفیق کار تھے اور مجھے ذاتی طور پر ان کے انتقال سے بے انتہا رنج ہوا ہے۔

مسٹر فینر براکوے ممبر پارلیمنٹ ۔ مولانا محمد علی پسندیدہ اوصاف کے مالک تھے۔

لارڈ سینکی ۔ مولانا محمد علی اول و آخر ہندوستان کی فلاح و بہبود کے طالب تھے۔

سر محمد شفیع ۔ مولانا محمد علی محب وطن اور ایثار شعار انسان تھے۔

مسٹر ایس این مکرجی کلکتہ مولانا محمد علی آکسفورڈ کی روایات کا بہترین نمونہ تھے آکسفورڈ ان پر ہمیشہ اور زیادہ سے زیادہ ناز کریگا مولانا کی شخصیت عظیم الشان ہمہ گیر اور قومیت کی پیکر تھی۔ مولانا مردوں میں زندگی کی روح پھونک دیتے تھے۔

پنڈت موتی لال نہرو مولانا محمد علی میرے پرانے دوست، پختہ کار مسلمان اور ہندوستان کی زبردست شخصیت تھے۔

فیڈرل سب کمیٹی کے ارکان مولانا محمد علی ایک ایسی شخصیت تھے جنھوں نے اپنے فرض کی حمایت میں اپنی کمزوری اور تکالیف کی مطلقاً پاس نہیں کیا۔

مولانا [illegible]رت موہانی [illegible]ں کی نسبت صحیح کہا ہے کہ میرا بھائی اسلام کا سپاہی تھا۔ اور سپاہی کے لئے اس سے بہتر اور کیا انجام ہو سکتا ہے کہ اس نے لڑتے ہوئے اپنی جان دی۔

مولانا شوکت علی - میرا بھائی ایک بہادر اور شجاع سپاہی تھا۔

مولانا سید حسین احمد صاحب مولانا محمد علی آزادی ہند کے سب سے بڑے علمبرداروں میں سے تھے۔ اور انہیں اپنے ملک کی سیاسی نجات کے ساتھ خاص شغف تھا۔ ان کی نظر سیاسی۔ مذہبی اور فقہی معاملات میں اس بلندی پر پہنچ جاتی تھی جہاں ہر شخص کی نگاہ کا پہنچنا محال ہے۔

مسٹر سوبھاش بوس مولانا ایک بلند ارادہ اور ایک عدیم النظیر قائد تھے جو صف اول میں مصروف جنگ تھے آپ کی سرگرمیاں صرف مادر وطن تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ آپ کی نگاہ وسیع تر تھی۔ اور اتحاد مشرق آپ کی زندگی کا خواب تھا۔ مولانا میرے ذاتی دوست تھے۔ حال ہی میں چند امور میں مجھے مولانا سے اختلاف ہو گیا تھا لیکن بلاشبہ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان امور میں جن میں لوگ ان سے متفق نہیں۔ مولانا کا مقصد محض خدمت خلق تھا۔ مولانا کی زندگی آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ ایک قابل تقلید مثال ہوگی۔

مسٹر جیکر مولانا محمد علی ہندوستانی سیاسیات میں ایک اہم ہستی تھے اور انہوں نے قومی مفاد کی زبردست خدمت انجام دی تھی۔

پادری بی اے ناگ مولانا محمد علی آج ہم میں نہیں لیکن آج ان کی آواز پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ان کی شخصیت بلند تر تھی۔

مسٹر کیمبل (ڈاگریزیہ) کلکتہ مولانا محمد علی کی زندگی سیاسی و معاشرتی اعتبار سے نوجوانوں اور آئندہ نسلوں کیلئے ایک شاندار اسوۂ حسنہ ہے۔

سر سی پی راما سوامی آئر - مولانا محمد علی ایک طاقتور اور باثر شخصیت کے انسان تھے

مسٹر بی الیف بھڑوچہ بی اماں محترمہ نے اپنے عمل زندگی سے ایثار و قربانی کا جو سبق محمد علی کو سالہا سال تک پڑھایا تھا اس کو بھول جانا محمد علی کے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ تکلیف دہ بیماریاں اور دیگر آلام و مصائب محمد علی کی آخری زندگی پر چاروں طرف سے چھا گئے۔ آنکھوں نے جواب دیدیا تھا۔ پاؤں رہ نوردی سے انکار کر چکے تھے۔ قلب کمزور ہو گیا تھا۔ اور دماغ میں اضمحلال پیدا ہو چلا تھا۔ مگر پھر بھی ہندوستان کی شیرنی کے بچہ کا دل شیر کی طرح جوان و مضبوط تھا۔ ڈاکٹروں نے ولایت کے دور دراز سفر کو مہلک بتلایا اور گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہونے کی درخواست کی۔ محمد علی نے سب کی سن لی۔ مگر آخر کیا وہی جو اس کے ضمیر نے رائے دی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کانفرنس میں شریک ہو کر ملک و قوم کی اس خدمت کو ضرور انجام دیگا۔ جو ایک ذمہ دار ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی تھی۔

ہم اپنے خیال میں ان کی اس شرکت کو کتنا ہی ناز یبا سمجھیں مگر اس سے کس ہندوستانی کو انکار ہو سکتا ہے کہ اس کی نیت بخیر نہ تھی۔ جس کا ثبوت اس کی آخری تقریر ہمیشہ بہم پہنچاتی رہے گی۔ "مجھ کو آزادی دو نہیں تو قبر" ایک ایسا جملہ ہے جو محمد علی کے نام کو ابد الآباد تک زندہ رکھے گا۔ خدا مرحوم کی روح کو بی اماں کی روح پر فتوح کے ساتھ امن و عافیت میں رکھے ؛

وقلبی الیه مائلٌ ان اذہب [illegible]ق نیہ لازب بل تلزم

میرا قلب وجگر اس کی طرف اس طرح مائل ہے کہ نقطۂ قلب گویا اس کے ساتھ چپٹا ہے بلکہ لازم غیر منفک ہے

حیات بعد الممات

(از حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی)

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ — تا مژہ بر ہم زنیم از ماہ و پروین در گذشت
اے خوشا مشتِ غبار او کہ از جذبِ حرم — از کنارِ اُندلس و از ساحلِ بربر گذشت
خاکِ قدس اورا بہ آغوشِ تمنا در گرفت — سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت
می نگنجد جز بہ آن خاکے کہ پاک از رنگ و بوست — بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گذشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آن نورِ نگاہِ خاور از خاور گذشت

تاریخ وفات مولانا محمد علی

(از مولانا قوس حمزہ پوری)

تاریخ ارتحال جانگاہ۔ نیّر آسمان اعلیٰ حضرت۔ بلند پایہ یگانہ مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ

ہدیۂ نخیف قوس حمزہ پوری غفرلہٗ

ہر پیدا معتقد سے تاریخ نکلتی ہے۔ بلکہ چھٹے مصرع سے دو نکلتی ہیں

اور ہر مصرعہ کے اول حرف سے مولانا محمد علی ظاہر ہوتا ہے۔

ماہِ چرخِ ہندم [illegible] لولوے لالائے قوم

لندن از بہر خلاصِ ہند جاناں رفتہ بود — آہ در سر داشت شمع جامعہ سودائے قوم

نالہ بر لب۔ دیدہ گریاں۔ صدمہ ہا ماتم کنید — اے دریغا حامیٔ دین۔ وامقِ غمہائے قوم

شد بہر لطفِ عالم قوم آن شیدائے قوم — حیف از ما رفت مقبولِ حق دلجائے قوم

مسلماں را یوسف کنعانیئے از دست رفت — مقصدت شد فوت در امید نیکوہائے قوم

داغِ دل را سوزِ جاں را دادالحق ہجر او — عین عالم بود بنگہ صورت آن مولائے قوم

لوحِ قبرش از دلِ روح القدس بر آمدہ — یعنی گورش در جنانِ مطلق دلہائے قوم

حصۂ اول ختم شد

مجبوبہ کربلا - علامہ جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال ... کی ناول کا اردو ترجمہ جس میں وہ دردناک منظر دکھایا ہے۔ کہ کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں حق پرستوں کا خون کس بیدردی سے بہایا گیا معصوم بچوں اور عورتوں پر کیسے کیسے مظالم کئے گئے۔ اور یزید کی نفس پرستیاں اور عیاشیاں جن کا عام طور پر لوگوں کو حال معلوم نہیں۔ ظاہر کی گئی ہیں۔ قیمت عہ

انجام یزید - کربلا کے دردناک واقعات کا ڈرامہ اسٹیج پر لایا گیا ہے۔ یزید کی خلافت شریعت اور حرکات نفس پرستی کے حیا سوز مناظر۔ ڈرامہ ملک الکلام قوی امروہوی کی یادگار ہے۔ اس میں یہ بھی دکھایا ہے کہ ایک حسینہ نے یزید کا کیونکر خاتمہ کیا۔ قیمت ۱۰/

خانہ خدا میں شیر خدا کا قتل حضرت علی رضؓ کی شہادت کے مفصل حالات علامہ جرجی زیدان کا شاہکار ہے جس میں خوارج جنگ ... بنی امیہ و بنی ہاشم کی آویزش۔ اور خوارج کی دل ہلا دینے والی سازش ابن ملجم وغیرہ کا عبرتناک انجام ... در حسن وعشق کی کرشمہ سازیاں۔ قیمت ہر دو حصہ عمر

ہندوستانی آرسین لوپن اس میں بہرام نے اپنی حیرت انگیز کارروائیوں کیلئے لکھنؤ کا میدان منتخب کیا ہے جسمیں تاریخی واقعات اور ... اودھ کے مخفی خزائن کا ذکر اور سراغرسانی ... کا بہترین افسانہ ہے۔ قیمت مجلد ۹ر

یوسف وناہید یعنی خونی قلعہ ۱۰/

حسن کی ستم آفرینیاں جہاں پیرس کے ہوٹلوں میں کرشمہ سازہیں وہاں صحرائے لق ودق میں بھی اپنی ستمرانیوں سے نہیں چوکتیں۔ ... مجنوں عامری کی دلدادہ نہیں بلکہ سلطان نجد والی حجاز کی دلربا۔ ہر جو اپنے حسن عالمتاب کی ملکہ ہونے کے ... ریاست اور حکومت بھی کرتی ہے یہ کتاب جہاں ... کا مجموعہ ہے ... ظلم ... تعدی کی بھی داستان گو ہے اور عرب نجد کی ...

آپکی عمر ۱۲۰ سال ہو سکتی ہے ... بیٹے پوتے اور پڑپوتے چھوڑ سکتے ہیں۔ کتاب نہیں آبحیات ہے مسیح الملک مرحوم نے ... علمی تجاویز کو بیحد پسند کیا تھا۔ قیمت ۱۰/

دلہن کی ... پر کیف سماں کچھ خوف کچھ
شرم کچھ ہراس ... بے صبری کے جذبات
بیتابی کے نظارہ ہے دامن عصمت کے تارہائے نازک کو ڈھیں: بالتصویر قیمت عہ

سجیلہ کی ڈائری جس کو سجیلہ دلہن نے اپنی سہیلی اختر دلہن کی ڈائری کے جواب میں اپنی
شب عروسی کی سرگزشت لکھکر بھیجی ہے۔ جو بجنسہ چھاپ دی گئی ہے۔ بالتصویر قیمت عہ

لذت النکاح زن و شوہر کے تعلقات پر نہایت دلچسپ کتاب ہے جس کو جوانی اور اس کے
جذبات کا مکمل کورس کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نکاح کے بعد دولہا دولہن کیا
کریں اور ازدواجی تعلقات کا سلسلہ کیونکر بڑھائیں۔ قیمت عہ

دلہنوں کی کانفرنس ۔سات دلہنوں کی شب ہائے خلوت کی دلچسپ داستان۔ سات دلہنیں
ایک جگہ جمع ہوکر اپنے اپنے واقعات شب عروسی صحیح صحیح لیکن شرمیلے الفاظ میں سناتے ہوئے اصلاح رسوم
کا بیڑا اٹھاتی ہیں اور تعلیم اور حقوق نسواں کی طرف زور دیتی ہیں ہر ایک دلہن کی انوکھی سرگذشت ہے قیمت عہ

بیوی کے فرائض اس میں قرآن و حدیث سے اخذ کر کے ایسے مضامین درج کئے گئے ہیں کہ
جن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ عورتوں کیا فرائض ہیں۔ اس کی ہدایتوں پر عمل کر کے ایک سرکش
اور نافرمان عورت بھی اپنے خاوند کی فرمانبردار اور اطاعت گذار بیوی بن جائیگی۔ دنیوی زندگی
میں سچی شادمانی ہوگی۔ اور آخرت میں خدا و رسول کی خوشنودی و نجات بدتی۔ قیمت ۸

لطف شباب یہ کتاب دراصل رجوع الشیخ کا اردو ترجمہ ہے جو سلطان سلیم خان ترکی کیلئے لکھی گئی
تھی۔ اس کتاب کو عربی کوک شاستر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اسمیں مردوں اور عورتوں
کی معلومات درج ہے جو کسی کتاب میں نہیں ہو سکتی۔ نیز عورت و مرد کے ہر قسم پوشیدہ امراض کا ذکر اور اس کے
تیر بہدف نسخے نیز مرد و عورت آخر عمر تک جوان رہنے کی ہدایات بھی ہیں قیمت ہر دو حصہ عہ

ملنے کا پتہ خیریتی بکڈپو کوچہ چیلان دہلی

قانون مواصلت حصہ اول عیش و نشاط کی زندگی [illegible] کتاب کی ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ وقت سے پہلے آپ کی قوت میں کبھی کمزوری پیدا نہیں ہوسکتی اور شباب کی پوری کیفیت سے آپ لطف اٹھا سکیں گے۔ قیمت صرف عہ/

عہد شباب حصہ دوم قانون مواصلت۔ اگر آپ نے اپنی جوانی کو ناسمجھی کے ہاتھوں برباد کر دیا ہے، اگر آپ اپنی جوانی کو بڑھاپے تک قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تو عہد شباب منگائیے۔ کیونکہ اس میں جوانی کو قائم رکھنے اور کمزوری دور کرنے کے بہترین ہدایات اور تیر بہدف نسخے درج ہیں۔ عہد شباب عورت اور مرد دونوں کیلئے ایک اچھے مشیر۔ ایک اچھے طبیب ایک اچھے ہمدرد کا کام دیگی قیمت ۱۲/

ثمرۂ وصال حصہ سوم قانون مواصلت۔ اس زمانہ میں عام طبائع کا جمہوریت کی طرف میلان ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے ایشیا اور یورپ میں افزائش نسل ہی کو قومی ترقی کا صحیح معیار سمجھا گیا ہے۔ یہ کتاب جہاں عیش و سرور کی منازل طے کرانے کے لئے بہترین چیز ہے وہاں ترقی نسل کا بھی باعث ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کی پرورش، تربیت اور تعلیم کے لئے بھی بہترین ہدایات دی گئی ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ قیمت ۱۰/

جنس لطیف حسن کی جو کشمکش محبت کرنیوالوں کو عاشقی کا سرٹفیکیٹ دلاتی ہے اسکی برق پاشیاں عاشقوں کیلئے خواہ کتنی ہی قابل قدر کیوں نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ایک طرف عاشق کو اور دوسری طرف خود معشوق کو دائم المریض بنا دیتا ہے جس کا نتیجہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب قدرت ان کو ایک دوسرے کا شریک زندگی بنادے۔ پھر یا تو لاولدی کی شکایت ہوتی ہے یا اولاد کی کمزوری، اور کوتاہی عمر۔ یہی حال ان میاں بیویوں کا ہوتا ہے جو حد سے زیادہ ایک دوسرے کے گرویدہ ہوں۔ لہٰذا ان کے لئے جنس لطیف کیمیا کا اثر رکھتی ہے اسکے علاوہ جن کی اولاد زندہ نہیں رہتی ان کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے (زیر طبع)

ملنے کا پتہ:۔ قریشی بکڈپو کوچہ چیلان دہلی

علم [illegible] اکرنیوالا ماہوار

نئی روشنی

نئی روشنی میں از اول تا آخر نہایت دلچسپ دلکش اور دلنواز مضامین درج ہوتے ہیں۔

نئی روشنی میں اعلیٰ درجہ کے عربی تراجم، بلند پایہ مضامین اور نہایت دلچسپ افسانے شائع ہوتے ہیں

نئی روشنی اسلامی معارف کا آئینہ، ادبی دلچسپیوں کا مجموعہ اور تاریخی معلومات کا خزانہ ہے

نئی روشنی کا ہر مضمون اپنے اندر انقلاب پیدا کرنے کی حیرت انگیز قوت رکھتا ہے

نئی روشنی میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جاتی ہے اور قدامت پسندوں کی غلطیوں پر عالمانہ نکتہ چینی کی جاتی ہے

نئی روشنی اسلئے جاری کیا گیا ہے کہ خفتہ مسلمانوں کو بیدار کرے۔ نئی روشنی کے نوجوانوں کو اسلام کی حقیقت سمجھائے اور جنت اور دوزخ کے ٹھیکیداروں کے حال و قال پر روشنی ڈالکر اسلام کی حفاظت کا فرض ادا کرے

نئی روشنی میں وہ تمام ادبی اور تفریحی دلچسپیاں موجود ہیں جو ایک ترقی یافتہ رسالہ میں ہونی چاہئیں

نئی روشنی کے تمام مضمون نگار اعلیٰ درجہ کی ہستیاں [illegible] علامہ عظیم المنزلت ادیب اور لازوال شہرت کے مالک ہیں

نئی روشنی موجودہ زمانہ کے اسلام سے بیخبر نئی [illegible] کے مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کا حامی اسلام بنا دیگا۔

نئی روشنی ان تمام خرافات کو مٹانے کی کوشش [illegible] جو خود ہدایت نے خواہ مخواہ اسلام کا نام لیکر دنیا میں پھیلائی ہیں

[illegible] لکھائی چھپائی [illegible] نئی روشنی [illegible] ۵۶ صفحے قیمت سالانہ عہ

طلبہ اور غیر مستطیع بھائیوں سے [illegible] مفت [illegible] المشتہر: منیجر رسالہ نئی روشنی دھلی

مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ

فوٹو بزمانہ طالب علمی اکسفرڈ یونیورسٹی

مزار

قبه صغرا در صحن مسجد عمر